اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحم کے ساتھ

ماہنامہ

مئی 2016ء

قندیلِ ادب

مدیر: رانا عبدالرزاق خان
07886304637 & 02089449385
rana_razzaq@hotmail.com

وصی شاہ

ہجر کا تارا ڈوب چلا ہے ڈھلنے لگی ہے رات وصیؔ
قطرہ قطرہ برس رہی ہے اشکوں کی برسات وصیؔ

تیرے بعد یہ دُنیا والے مُجھ کو پاگل کر دیں گے
خُوشبو کے دیس میں مُجھ کو لے چل اپنے ساتھ وصیؔ

یُونہی چُپ کی مُہر لگا کر کب تک گُم سُم بیٹھو گے؟
خاموشی سے دم گھٹتا ہے چھیڑو کوئی بات وصیؔ

چھوڑ وصیؔ اَب اُس کی یادیں تُجھ کو پاگل کر دیں گی
تُو قطرہ ہے وہ دریا ہے دیکھ اپنی اَوقات وصیؔ

www.qindeel-e-adub.com

ماہنامہ قندیل اَدب اِنٹرنیشنل لندن

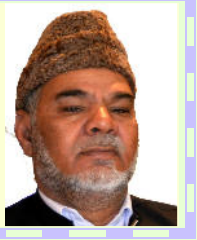

مدیر:
رانا عبدالرزاق خان

شمارہ نمبر:41 مئی 2016ء

فہرست

نامے جو میرے نام آتے ہیں	ادارہ	2
غزلیات: امتہ الباری ناصر، ہری چند اختر، حافظ سید مختار احمد شاہجہانپوری، بی اے رفیق، ثاقب زیروی، ابن ریاض، بشارت محمود طاہر، نوشی گیلانی، امجد اسلام امجد، مشتاق عاجز، نظام رامپوری، پریم وار برٹنی، مجروح سلطان پوری، سعد حمید، ندا فاضلی، فیض احمد فیض، چوہدری محمد علی مضطر عارفی، آدم چغتائی، نور الجمیل نجمی، عامر حسنی، عبدالجلیل عباد، مبارک صدیقی، ارشاد عرشی ملک، اطہر حفیظ فراز، ناصر کاظمی، عاصی صحرائی،		3-7
پندرھویں صدی کے ٹلاؤں کی اَقسام	اے۔آر۔راجپوت	8
شاعر ہونا کیا معنی رکھتا ہے	رشید صدیقی	9
یہ کتابیں یہ رسالے	سید کاشف رضا	10
شعراء کے لطائف	عبدالقدیر کوکب	11
دُم دار ستارے	فراز حمید خان	11
حلیم کے متعلق گستاخی	عاصی صحرائی	12
دنیا کو بدلنے والی ایجادات	اعزاز لطیف خان	12
افسانہ، دیوار	فرخندہ رضوی ریڈنگ	13
'چوراہا' سے اقتباس	حسن نثار	15
بری امام صوفی بزرگ	عامر سہیل	16
ڈوار فزم کیا ہے؟	بلال افتخار	17
جے پی ایس کڑا... یا... زیور	رجل خوشاب	17
''قریۂ جاوداں'' پر ''ایک طالبہ'' کا تبصرہ	داؤد طاہر	18
برطانیہ میں مذہب سے متعلق قوانین میں اصلاح	(ڈاکٹر طارق احمد مرزا۔آسٹریلیا)	19
ڈاکٹر عبدالسلام تجھ پر سلام	ندیم احمد فرخ	20
محترم سلیم الدین قریشی مرحوم	(محمد ایوب اولیاء)	21
چار دیواری	امجد مرزا امجد	21
اسلام پاکستان اور نظام مصطفی	قیوم نظامی	22
اُردو کے ''پردیسی'' خادم	(ڈاکٹر طارق احمد مرزا۔آسٹریلیا)	23
خواجہ محمد عارف صاحب کے متعلق تاثرات	خواجہ خورشید احمد، میرپور	25
فاروق نسیم کے مجموعہ کلام ''عکاسیاں'' پر تبصرے	(سید شمیم احمد)	25
رشتوں پر اعتبار کیسے آئے؟	ثمینہ فیاض	26
انداز تکلم میں شائستگی اپنایئے	ثقلین مبارک آسٹریلیا	27
کینیڈا کے متعلق مفید معلومات	زکریا ورک۔ٹورنٹو	28
جستہ جستہ۔	عاصی صحرائی	29-31

مجلس ادارت

زکریا ورک، امجد مرزا امجد، ایم اے حق بھارت، خواجہ عبدالمومن ناروے، آصف علی پرویز

نگرانِ اعلیٰ	:	خان بشیر احمد خان رفیق لندن
مدیر	:	رانا عبدالرزاق خاں
معاون مدیر	:	سید حسن خان
مدیر خصوصی	:	سہیل لون
ڈیزائنر	:	کرشن احمد
مینجنگ ڈائریکٹر	:	عاصی صحرائی
فوٹو گرافی	:	قاضی عبدالرشید، فضل عمر ڈوگر
آڈیو وڈیو	:	محمد اشرف خاکی

اراکین مشاورتی بورڈ

آدم چغتائی، منور احمد کنڈے، رضیہ اسمٰعیل برمنگھم، رند ملک کنیڈا، اسلم ناصر آسٹریلیا، اے حق یوکے ٹائمز، ثقلین مبارک آسٹریلیا، رانا مبارک احمد بحرین، بشیر احمد خان سویڈن، راجہ منیر احمد، ڈاکٹر منصور خوشتر بھارت، منور احمد خورشید۔

گزارش

ہم سب اہل علم احباب کی خدمت میں گذارش کرتے ہیں کہ اپنے ادبی فن پارے، غزل، نظم، افسانہ، مشاعرے کی روئیداد وغیرہ جو بھی اِن پیج میں ارسال کیا جائے گا۔ بلاتفریق اسے معیار کے مطابق شائع کیا جائے گا۔ جو دوست بھیجتے ہیں اُن کی قدر کی جاتی ہے۔ قندیل ادب تمام ممالک جہاں اسے قارئین موجود ہیں تقریباً دو لاکھ قارئین تک جاتا ہے اور ویب سائٹ سے بھی پڑھا جاتا ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ ہم نادر اور نئی تخلیقات کو اس میگزین میں جگہ دیں۔ اور ہر بھیجنے والوں کی حوصلہ افزائی کریں، اور اس میگزین کا معیار بھی عوامی کریں۔ ہر ادیب و شاعر، نقاد، افسانہ نگار، اُردو کے خدمتگار کی عزت افزائی کریں۔ ہمیں کوئی صلہ مقصود نہیں۔ اگر آپ نے کوئی کتاب لکھی ہے تو اس کا نام اور تعارف لکھ بھیجیں۔ اگر آپ کے پاس ادبی فن پارہ کوئی نہیں تو اپنے ریمارکس ہی ارسال کر دیا کریں تا کہ ہم اپنا محاسبہ کرتے رہا کریں۔ شکریہ۔

رانا عبدالرزاق خاں

نامے جو میرے نام آتے ہیں

ہدایت اللہ ہادی کنیڈا لکھتے ہیں:

گرامی قدر رانا عبدالرزاق خان صاحب

کہیئے مزاج گرامی

اُردو ادب سے آپ کا لگاؤ قابل تحسین ہے۔ جب بھی آپ کی طرف سے قندیلِ اَدب موصول ہوتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ فرصت کے لمحات میں پڑھوں گا۔ لیکن پھر فوراً پڑھنا شروع کر دیتا ہوں اور اوّل سے آخر تک بڑی یکسوئی سے پڑھتا ہوں اور خوب لطف اندوز ہوتا ہوں۔ بعض کام اُدھورے رہ جاتے ہیں لیکن ان کا افسوس نہیں ہوتا۔ کیونکہ ذوق کو کچھ تسکین مل جاتی ہے۔ یہی وہ کشش ہے، یہی وہ خوبصورت انتخاب ہے جو آپ کے علمی اور اَدبی ذوق کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہی وہ حسن ہے جو اس رسالہ کو ماہ بماہ چار چاند لگاتا ہے۔ یورپ اور شمالی امریکہ میں اُردو ادب کو زندہ رکھنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ لیکن پھر بھی جو لوگ اس ورثہ کو زندہ رکھتے ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں وہ قابل تعریف ہیں۔ اللہ ان کے ذوق میں مزید نکھار پیدا کرے۔

ایک ثلاثی حمایت علی شاعر کی پیش خدمت ہے۔

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اُسے محبت تراش لے تو، یہی صنم ہے
اسے عقیدت نواز دے تو، یہی خدا ہے

مکرم ومحترم جناب طارق مرزا آسٹریلیا سے فرماتے ہیں۔

مکرم ومحترم جناب مدیر صاحب

''قندیل ادب، انٹرنیشنل''

آداب وتسلیمات !

اپریل 2016ء کا شمارہ حسب معمول بہت ہی اعلیٰ معیار کا حامل ہے۔ بہت بہت مبارک باد... چشمِ بددور! مشفقی جناب امجد مرزا امجدؔ صاحب کا دم غنیمت ہے کہ رسالہ کے حصہ نثر کی رونق دوبالا کر دیتا ہے ورنہ زیادہ تر تو یہ سیاسی و نیم سیاسی تنقیدی کالموں پر مشتمل ہوتا ہے جن کی آج کل ویسے ہی ہر رسالہ، ہر اخبار، ہر ویب سائٹ اور بلاگ وغیرہ میں کثرت پائی جاتی ہے۔ احقر کی رائے میں ماہ بماہ تنقیدی کالموں کے ساتھ ساتھ خالص ادبِ لطیف یعنی غیر سیاسی، غیر تنقیدی اور ''کلاسیکل'' اردو نثر سے بھی کچھ انتخاب شامل اشاعت کئے جانے کی ضرورت ہے۔ بیشک یہ نثری ادب محض ''ادب برائے ادب'' نہ ہو، مقصد قندیل میں شعری اور نثری ادب کا توازن برقرار رکھنا ہو۔ ویسے تو ماشاء اللہ آپ کی روشن کی ہوئی یہ ''قندیل'' اب آسمانِ ادب کا ایک ''فانوس''، بلکہ یوں کہیں کہ ایک کہکشاں بن کر دنیا کے ہر براعظم میں اپنی ٹھنڈی میٹھی خوشگوار روشنی سے قلب ونظر کو سکون بخشتی نظر آتی ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

اسی طرح سے خاکسار کی ایک تجویز یہ بھی ہے کہ سال میں ہر تین چار ماہ بعد ایک مصرع طرح مقرر کر کے اس پر یار دوستوں کو طبع آزمائی کی دعوت دی جائے اور پھر بہترین منتخب کلام قندیل میں شائع کیا جائے۔

احمد منیب صاحب پاکستان سے رقم طراز ہیں:

رانا عبدالرزاق خان صاحب السلام وعلیکم ورحمۃ اللہ

اپریل کا شمارہ ماشاءاللہ ملا کیا کہنے صاحب!

آپ کی بے لوث خدماتِ اُردو کو جس قدر بھی سراہا جائے کم ہے۔ آپ خود بھی اچھا لکھتے ہیں مگر یہ آپ کی بہت بڑی کامیابی ہے کہ ساری دنیا سے آپ نے معیاری لکھنے والوں کو جمع کر لیا ہے۔ قندیل ادب کے ذریعہ ہمیں کئی اہم معلومات مل جاتی ہیں جو کسی اور جگہ نہیں مل سکتیں۔ یہاں پاکستان تو بدقسمتی سے علمائے سُو کے شکنجے میں آچکا ہے۔ میں نے بھی کئی ممالک کا سفر کیا ہے۔ بے گھر لوگوں کے آباد شہر پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ آپ نے اپنے مضامین میں کئی حقیقی مسائل سے پردہ اُٹھایا ہے۔ شاعری کا انتخاب بہت پسند آیا۔ یہ کئی لحاظ سے بہت ہی اچھا اور مقبول عام رسالہ ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو اور آپ کی ٹیم کو جزا دے۔ آمین۔

غزل - عبیداللہ علیم

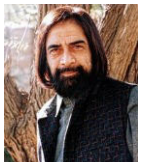

ہجر کرتے یا کوئی وصل گزارہ کرتے
ہم بہر حال بسر، خواب تمہارا کرتے
ایک ایسی بھی گھڑی عشق میں آئی تھی کہ ہم
خاک کو ہاتھ لگاتے تو ستارا کرتے
اب تو مل جاؤ ہمیں تم کہ تمہاری خاطر
اتنی دُور آگئے دنیا سے کنارا کرتے
محوِ آرائشِ رُخ ہے وہ قیامت سرِ بام
آنکھ اگر آئینہ ہوتی تو نظارا کرتے
ایک چہرے میں تو ممکن نہیں اتنے چہرے
کس سے کرتے جو کوئی عشق دوبارا کرتے
جب سے یہ خانۂ دل آپ کی خلوت کے لئے
پھر کوئی آئے یہاں، کیسے گوارا کرتے
کون رکھتا ہے اندھیرے میں دیا آنکھ میں خواب
تیری جانب ہی تیرے لوگ اشارا کرتے
ظرفِ آئینہ کہاں اور ترا حسن کہاں
ہم ترے چہرے سے آئینہ سنوارا کرتے

غزل

حمد

امتہ الباری ناصر

تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں
میرا اپنا نہیں کوئی تیرے سوا
تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں
تجھ سے تو نہیں مرا حال چھپا
تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں
دلدل ہے گناہوں کی گہری
ٹکتے نہیں میرے پاؤں کہیں
تو زور سے تھام لے ہاتھ مرا
تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں
وہ کام کرالے تو مجھ سے
جس میں ہو شامل تیری رضا
لینا نا حساب کتاب مرا
تم سے نہ کہوں توکس سے کہوں
دشمن کو حسد نے اندھا کیا
کرتے ہیں جفا بے خوفِ خدا
دل کر چی کرچی ٹوٹ گیا
تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں
ظلمت کی اندھی راہوں میں
نفرت کی ظالم بانہوں میں
اب ہوگیا بالکل حال تبہ
تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں
جو گھاؤ دیئے ہیں اپنوں نے
گہرے ہیں ہردم رِستے ہیں
میں نے چپکے چپکے درد سہا
تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں
ترا نام غفور ہے پیارے خدا
بخشش میں تجھے آتا ہے مزا
رکھ لینا غریب کا پاسِ حیا
تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں
میں تجھ سے محبت کرتی ہوں
رو رو کر عرض یہ کرتی ہوں
مجھ سے نہ کبھی بھی ہونا خفا
تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں

نعت

ہری چند اختر

کس نے ذرّوں کو اُٹھایا اور صحرا کردیا
کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کردیا
آدمیت کا غرض ساماں مہیا کردیا
اک عرب نے آدمی کا بول بالا کردیا
سات پردوں میں چھپا بیٹھا تھا حسن کائنات
اب کسی نے اس کو عالم آشکارا کردیا
زندہ ہوجاتے ہیں جو مرتے ہیں اس کے نام پر
اللہ اللہ موت کوکس نے مسیحا کر دیا
شوکت مغرور کا کس شخص نے توڑا طلسم
منہدم کس نے الٰہی قصرِ کسریٰ کردیا
کس کی حکمت نے یتیموں کو کیا در یتیم
اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کردیا
کہہ دیا لاتقنطوا اخترؔ کسی نے کان میں
اور دل کو سربسر محوِ تمنا کر دیا

پیامِ محبت ـ اسلم چغتائی

نفرت کی دیواروں کو ہم نے گرایا ہے
محبت کی خوشبو کو دنیا میں ہم نے پھیلایا ہے
ایک ہی خالق کی ہیں مخلوق سارے
انسانیت سے پیار دلوں میں ہم نے بسایا ہے

غزل

محترم حافظ سید مختار احمد شاہ جہان پوری

زباں کے سخت مگر دل کے پیارے ہوتے ہیں
ذرا ذرا سے منافق تو سا رے ہوتے ہیں
دیارِ عشق کا اُلٹا نظام چلتا ہے
یہاں کے سارے منافعے،خسارے ہوتے ہیں
تم اپنی رائے بدلنے میں حق بجانب ہو
ہر آدمی نے کئی رُوپ دھارے ہوتے ہیں
انہیں کو جیت کا اعلان وقت کرنا ہے
محبتوں میں بظاہر جو ہارے ہوتے ہیں
گر آسماں کی بلندی سے دیکھیئے مختار
زمیں پہ چلتے دیئے بھی ستارے ہوتے ہیں

ناصر

مرسلہ۔بی اے رفیق

اُٹھی ساگر میں طغیانی کنارے مٹ گئے سارے
کبھی جوساتھ چلتے تھے وہ دھارے مٹ گئے سارے
تپش تو ساتھ رہتی ہے سدا گزرے زمانے کی
نجانے کس طرح دل سے شرارے مٹ گئے سارے
ابھی کھلنے ہی پایا تھا چمن دل کی اُمیدوں کا
خزاں نے آنکھ کھولی تو نظارے مٹ گئے سارے
تیری یادیں بہا کر لے گئیں کچھ اس طرح آنکھیں
تلاطم خیز اشکوں سے کنارے مٹ گئے سارے
کبھی قسمیں جو کھاتے تھے ہمیشہ ساتھ رہنے کی
یہ کیسا دور آیا ہے سہارے مٹ گئے سارے
سے کی تیز آندھی نے انہیں پَل میں اُڑا ڈا لا
سجا رکھے تھے جو سپنے تمہارے مٹ گئے سارے
ہوئی ہے بھول کوئی تو خدا کی یاد سے ناصرؔ
لکھے تھے لوح پر جتنے ستارے مٹ گئے سارے

دُعا

ثاقب زیروی

دعا کرو کے سروں پے رہے وہ ابرِ کرم
دلوں میں نور کی کھیتیاں اُگاتا رہے
دعا کرو کہ نہ گہنائے تا ابد وہ چاند
جو ظلمتوں میں دیئے پیار کے جلاتا ہے
دعا کرو وہ شجر عمر بھر رہے قائم
وہ جس کے سائے میں ہر شخص چین پاتا ہے
دعا کرو کہ نہ آنچ آئے اس کے سر پہ کبھی
جو سب کو پیار سے اپنے گلے لگاتا ہے
دعا کرو وہ خزانہ کبھی نہ ہو خالی
جو غم نصیب غریبوں کے کام آتا ہے
دعا کرو کہ وہ پرچم سدا بلند رہے
خدا کے دیں کی طرف جو ہمیں بلاتا ہے

غزل

بشارت محمود طاہر

ہر ایک غم سے ہر ایک فکر سے بری کر دے
مرے وجود کے کاسے میں زندگی بھر دے
اُٹھا لے دل سے یہ درد اور کرب کے موسم
میرے نصیب میں مولا تو روشنی بھر دے
بچا لے مجھ کو اور مرے نفس کو تباہی سے
تو میرے بخت میں گدا گری بھر دے
میں بے خبر ہوں ترے قرب کی حقیقت سے
بھٹک رہا ہوں اندھیروں میں رہبری کر دے
مجھے بچا لے زمانے کے سب خداؤں سے
میرے نصیب میں اپنی ہی بندگی کر دے
میری وفا کو اُجالوں کی فصل تازہ دے
میرے غرور کو مومن کی عاجزی دے

غزل

ابن ریاض

قربتوں سے پوچھتا ہوں کتنی دور ہو
دوستوں سے پوچھتا ہوں کتنی دور ہو
زندگی اک امتحاں ہے گزر ہی جائے گی
راستوں سے پوچھتا ہوں کتنی دور ہو
خوشیاں ِ ،غم، الم ساتھ ساتھ ہیں
اُلفتوں سے پوچھتا ہوں کتنی دور ہو
بے حسی تکلیف دے جب دوسرا کرے
اذیتوں سے پوچھتا ہوں کتنی دور ہو
تلخیوں سے وحشت ہے مجھے بھی
محبتوں سے پوچھتا ہوں کتنی دور ہو

غزل

نوشی گیلانی

یہی نہیں کوئی طوفان میری تلاش میں ہے
کہ موسمِ غمِ جاناں میری تلاش میں ہے
وصالِ رُت سے مگر دل کو ایسا لگتا ہے
ستارہء شبِ ہجراں میری تلاش میں ہے
میں فیصلے کی گھڑی سے گزر چکی ہوں مگر
کسی کا دیدہء حیراں میری تلاش میں ہے
یہ بے یقیں سی آسودگی بتاتی ہے
کہ ایک قریہء ویراں میری تلاش میں ہے
میں تیرگی میں محبت کی اک کہانی ہوں
کوئی چراغ سا عنوان میری تلاش میں ہے
یہ کیسا خواب تھا دھڑکا سا لگ گیا دل کو
کہ ایک شخص پریشاں میری تلاش میں ہے

سامراج - اسلم چغتائی

اقوام کو آپس میں لڑا دیتے ہیں
فوجی کبھی عوام کو بغاوت پر اُکسا دیتے ہیں
ملکی وسائل پہ قبضہ جمانے کے لئے
سازشوں کے نئے جال بچھا دیتے ہیں

بشیر بدر

مرسلہ۔ بی اے رفیق

ابھی اس طرف نہ نگاہ کر میں غزل کی پلکیں سنوار لوں
مرا لفظ لفظ ہو آئینہ تجھے آئینے میں اُتار لوں
میں تمام دن کا تھکا ہوا تو تمام شب کا جگا ہوا
ذرا ٹھہر جا اسی موڑ پر ترے ساتھ شام گزار لوں
اگر آسماں کی نمائشوں میں مجھے بھی اذنِ قیام ہو
تو میں موتیوں کی دوکان سے تری بالیاں ترے ہار لوں
کہیں اور بانٹ دے شہرتیں کہیں اور بخش دے عزتیں
مرے پاس ہے مرا آئینہ میں کبھی نہ گرد و غبار لوں
کئی اجنبی تری راہ میں مرے پاس سے یوں گزر گئے
جنہیں دیکھ کر یہ تڑپ ہوئی ترا نام لے کے پکار لوں

غزل

امجد اسلام امجد

حضورِ یار میں حرفِ التجا کے رکھے تھے
چراغ سامنے جیسے ہوا کے رکھے تھے
بس اک اشکِ ندامت نے صاف کر ڈالے
وہ سب حساب جو ہم نے اُٹھا کے رکھے تھے
سمومِ وقت نے لہجے کو زخم زخم کیا
وگرنہ ہم نے قرینے صبا کے رکھے تھے
بکھر رہے تھے سو ہم نے اُٹھا لئے خود ہی
گلاب جو تری خاطر سجا کے رکھے تھے
تمہی نے پاؤں نہ رکھا وگرنہ وصل کی شب
زمیں پہ ہم نے ستارے بچھا کے رکھے تھے
مٹا سکی نہ انہیں روز و شب کی بارش بھی
دلوں پہ نقش جو رنگِ حنا کے رکھے تھے
حصول منزل دُنیا کچھ ایسا کام نہ تھا
مگر جو راہ میں پتھر انا کے رکھے تھے

غزل

مشتاق عاجز

مسلسل رابطہ رکھا ہوا ہے
مگر اک فاصلہ رکھا ہوا ہے
سفر کہہ چکا حرفِ تمنا
زباں پر آبلہ رکھا ہوا ہے
جنوں کو پھر وہیں جانے کی ضد ہے
جہاں اک حادثہ رکھا ہوا ہے
وہ آنکھیں موند کر بیٹھے ہوئے ہیں
مقابل آئینہ رکھا ہوا ہے
فضائے بے یقینی میں بھی عاجزؔ
دُعا کا حوصلہ رکھا ہوا ہے

غزل

نظام رامپوری

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ
بے ساختہ نگاہیں جو آپس میں مل گئیں
کیا منہ پر اُس نے رکھ لئے آنکھیں چرا کے ہاتھ
یہ بھی نیا ستم ہے حنا تو لگائیں غیر
اور اُس کی داد چاہیں وہ مجھ کو دکھا کے ہاتھ
بے اختیار ہو کے جو میں پاؤں پر گرا
ٹھوڑی کے نیچے اُس نے دھرا مسکرا کے ہاتھ
قاصد ترے بیاں سے دل ایسا ٹھہر گیا
گویا کسی نے رکھ دیا سینے پہ آ کے ہاتھ
اے دل کچھ اور بات کر رغبت نہ دے مجھے
سننی پڑیں گی سینکڑوں اُس کے لگا کے ہاتھ

جواں دل - اسلم چغتائی

دل جواں ہو تو ذہن میں رُومان رہتا ہے
ہو جائیں بال سفید مگر عشق کا طوفان رہتا ہے
محبت کی راہ میں حائل نہیں ہے بڑھاپا یارو
اس عمر میں عشق کے لئے فارغ انسان رہتا ہے

غزل

پریم وار برٹنی

رات کی بھیگی پلکوں پر جب اشک ہمارے ہنستے ہیں
سناٹوں کے سانپ دلوں کی تنہائی کو ڈستے ہیں
کل تک مے خانے میں جن کے نام کا سکہ چلتا تھا
قطرہ قطرہ مے کی خاطر آج وہ لوگ ترستے ہیں
اے میرے مجروح تبسم! روپ نگر کی ریت نہ پوچھ
جن کے سینوں میں پتھر ہیں ان پر پھول برستے ہیں
شہر ہوس کے سودائی، خود جن کی روحیں ننگی ہیں
میرے تن کی عریانی پر آوازے کیوں کستے ہیں
چھین سکے گا کون صبا سے لمس ہماری سانسوں کا
ہم پھولوں کی خوشبو بن کر گلزاروں میں بستے ہیں
اشکوں کی قیمت کیا جانیں پیار کے جھوٹے سوداگر
ان سیّال نگینوں سے تو ہیرے موتی سستے ہیں
کون آئے گا ننگے پیروں شمع جلا کر شام ڈھلے
پریمؔ محبت کی منزل کے بڑے بھیانک رستے ہیں

غزل

سعد حمید

دن نکلے تو سورج الگ، شام ڈھلے وجدان الگ
اُمید الگ، آس الگ، سکون الگ، طوفان الگ
تشبیہ دوں تو کس سے، کہ تیرے حسن کا ہر رنگ
نیلا الگ، زمرد الگ، یاقوت الگ، مرجان الگ
تیری اُلفت کے تقاضے بھی عجب انداز کے تھے
اقرار الگ، تکرار الگ، تعظیم الگ، فرمان الگ
گر ساتھ نہیں دے سکتے تو بانٹ دو یکجان لمحے
مسرور الگ، نڈھال الگ، پُرکیف الگ، پریشان الگ
وقت رُخصت الوداع کا لفظ جب کہنے لگے
آنسو الگ، مسکان الگ، بے تابی الگ، ہیجان الگ
جب چھوڑ گیا تب دیکھا اپنی آنکھوں کا رنگ
حیران الگ، پشیمان الگ، سنسان الگ، بیابان الگ

غزل

مجروح سلطان پوری

جب ہوا عرفاں تو غم آرامِ جاں بنتا گیا
سوزِ جاناں دل میں سوزِ دیگراں بنتا گیا
رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسمِ چمن
دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا
میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایانِ شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا
شرحِ غم تو مختصر ہوتی گئی اس کے حضور
لفظ جو منہ سے نہ نکلا داستاں بنتا گیا
دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

غزل

ندا فاضلی

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کبھی زمیں کبھی آسماں نہیں ملتا
تمام شہر میں ایسا نہیں کہ خلوص نہ ہو
جہاں اُمید ہو اس کو وہاں نہیں ملتا
کہاں چراغ جلائیں کہاں گلاب رکھیں
چھتیں تو ملتی ہیں مگر مکاں نہیں ملتا
یہ کیا عذاب ہے کہ سب اپنے آپ میں گم ہیں
زباں ملی ہے مگر ہم زباں نہیں ملتا
چراغ جلتے ہیں بینائی بجھنے لگتی ہے
خود اپنے گھر میں ہی گھر کا نشاں نہیں ملتا

شاعری - اسلم چغتائی

فنِ شاعری کی عظمت یگانہ ہوتی ہے
فکر و جذبات سے اُلفت کا آئینہ ہوتی ہے
خدمت خلق گر اس کا مقصود ہو تو پھر
وہی نیکی ہر عزت کے آنے کا بہانہ ہوتی ہے

غزل

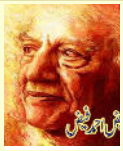

فیض احمد فیض

قرضِ نگاہِ یار ادا کر چکے ہیں ہم
سب کچھ نثارِ راہ وفا کر چکے ہیں ہم
کچھ امتحانِ دستِ جفا کر چکے ہیں ہم
کچھ اُن کی دسترس کا پتا کر چکے ہیں ہم
اب احتیاط کی کوئی صورت نہیں رہی
قاتل سے رسم و راہ سوا کر چکے ہیں ہم
دیکھیں ہے کون کون، ضرورت نہیں رہی
کوئے ستم میں سب کو خفا کر چکے ہیں ہم
اب اپنا اختیار ہے چاہیں جہاں چلیں
راہبر سے اپنی راہ جدا کر چکے ہیں ہم
ان کی نظر میں ،کیا کریں، پھیکا ہے اب بھی رنگ
جتنا لہو تھا صرفِ قبا کر چکے ہیں ہم
کچھ اپنے دل کی خو کا بھی شکرانہ چاہیئے
سو بار اُن کی خو کا گلہ کر چکے ہیں ہم

غزل

آدم چغتائی

فکر کا ساحل ڈوب گیا ہے جذبوں کی ارزانی میں
کشتی کو ثابت رکھنا ہے دریا کی طغیانی میں
دردکی اس دنیا میں ہر دم رنج ہی ملتے ہیں لوگو
اپنی قبا کو چاک ہی رکھنا اس دنیائے فانی میں
ظلم نہ سہنا ،شکوہ کرنا، دل والوں کا کام نہیں
ظالم کو بھی خوش رہنے دو، دو دن کی سلطانی میں
لب سے جب بھی بات کہو تم ،لفظ کی حرمت مت چھینو
مت بدلو انداز بیاں کا لفظوں کی عریانی میں
زخموں کے منہ کُھل جاتے ہیں طنز وطعن کے تیروں سے
تم کو کیا ملتا ہے یار و پتھر پھینک کے پانی میں
اہلِ ہوس کے ہاتھوں کا ہتھیار نہ بننا تم آدمؔ
بے شک موت ہی آجائے ،تم کو اس نافرمانی میں

غزل

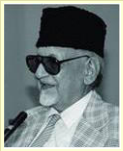

چوہدری محمد علی مضطرؔ عارفی

گھِرا ہوا تھا مَیں جس روز نکتہ چینوں میں
وہ بے لحاظ کھڑا تھا تماش بینوں میں
وہ کش مکش ہوئی انکار کے قرینوں میں
رہا نہ فرق شریفوں میں اور کمینوں میں
مری خبر سرِ اخبار چھاپنے والا
ملا تو ڈوب گیا شرم سے پسینوں میں
وہ اپنے عہد کی آواز کا ڈرایا ہوا
کھڑا تھا صورتِ دیوار ہم نشینوں میں
نحیف رُوح بلکتی رہی کنارے پر
بدن کا بوجھ بہا لے گئے سفینوں میں

ق

یہ کس کے عکس کی آہٹ مکان میں آئی
یہ کون ہولے سے اُترا ہے دل کے زینوں میں
وہی لباس، وہی خدّوخال ہیں اس کے
وہ ایک پھول ہے خوشبو کے آبگینوں میں
کبھی تو اس سے ملاقات ہو گی جلسے پر
کبھی تو آئے گا وہ وصل کے مہینوں میں
صلیبِ عشق پہ چڑھنے کی دیر تھی مضطرؔ!
وہ پھول برسے، گڑھے پڑ گئے زمینوں میں

غزل

نورالجمیل نجمی

صحراؤں پر ہولے ہولے بادل بن کر آؤ تم
جنگل جنگل ٹوٹ کے برسو کلی کلی مہکاؤ تم
پربت پربت رنگ بکھیرو ڈالی ڈالی پھول دھرو
دُور فلک کی محرابوں میں اپنے رنگ جماؤ تم
نظر اُتاروں سانسیں واروں دھڑکن فرشِ راہ کروں
جب بھی اپنی نظرِ کرم کی نظرِ کرم فرماؤ تم
کاش کبھی سسکی بھی سسکو ڈھلو کبھی کسی آنسو میں
کاش کبھی اُس کے درشن کو اپنے آپ سے جاؤ تم

غزل

عامر حسنی

خوب لمحات ترے ساتھ بِتائے جاؤں
آنکھ تارے شبِ وجدان سے پائے جاؤں
تیرے نیناں سے ٹپکتے ہوئے موتی پاؤں
اور یہ دُرّ ثمیں رُوح پہ لائے جاؤں
زندگانی تری اُلفت میں غریقِ حیرت
رُخِ روشن ترے خرمن میں نہائے جاؤں
دید نی فصل گل لالہ کا موسم جیسے
اَرغوانی تری رنگت پہ لٹائے جاؤں
دیدہ ءِ دل سے ترے قلب کے اندر جھانکوں
اور اس دل سے تر اقلب ملائے جاؤں
دل لبھاتی تری مسکان برستی مستی
غیر ممکن رُخِ ماہم و ہ بُھلائے جاؤں
حُسن اس کا حَسَنی دل پہ ہے ایسا حاوی
جلوت و خلوتِ جاناں میں بسائے جاؤں

غزل

عبدالجلیل عباد

خورشید بدن صورت مہتاب ہیں لوگو
ہم اہل جنوں دہر میں نایاب ہیں لوگو
چھوڑ کر ہمیں بھری پیاسی ہوائیں
پہچانوں ہمیں ہم ہی مئے ناب ہیں لوگو
یہ عشو ستارہ تو کبھی بجرواں ہے
فرعون ہوئے اس میں غرقاب ہیں لوگو
ہر دور میں نمرود بھی ٹکرائیں ہیں ہم سے
ہر بار یہ حسرت کا بنے باب ہیں لوگو
مر مر کہ جب یہ زندہ ہوئی خاک ہماری
جب جاکے سمجھ آئی کہ ہم خواب ہیں لوگو

غزل

مبارک صدیقی

شہر میں آئے تو پھر یہ حادثہ ہونا ہی تھا
ایک دن اندر کا انسان لاپتہ ہونا ہی تھا
چُننے والوں نے چُنے حاکم یزیدی قوم سے
اب گلی کوچوں کا منظر کربلا ہونا ہی تھا
بات چل نکلی تھی خوشبو روشنی اور پھول کی
اب میری محفل میں تیر اذکر ہونا ہی تھا
میں نے اُس کی راہ میں رکھے تھے خوشبو کے چراغ
سو مرا اُس گل بدن سے رابطہ ہونا ہی تھا
آج پھر اخبار پڑھ کے چشم تر کہنے لگی
آج ہوتی گر قیامت نے بپا ہونا ہی تھا
لوگ کہتے ہیں کوئی عیسیٰ ہے اُترا آج کل
زخم کہتے ہیں میرے یہ معجزہ ہونا ہی تھا
وہ دعا کرتے ہوئے تھکتا نہ تھا تھکتا نہ تھا
آسماں سے اُس کے حق میں فیصلہ ہونا ہی تھا
کل کوئی لفظ محبت سن کے دُکھ سے رو پڑا
مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی دل تو دُکھا ہونا ہی تھا
وہ بھی دیتا ہے حوالے اب میرے اشعار کے
میں نہ کہتا تھا کہ مبارکؔ نے بڑا ہونا ہی تھا

غزل

ارشاد عرشی ملک

کیا اُس شوخ نے آنکھوں میں گھر آہستہ آہستہ
ہوا دل کا جہاں زیر و زبر آہستہ آہستہ
ابھی تک یاد ہے اُ س لمحہ تسخیر کا جادُو
ہوئے ہم اُن کے خود کو بھول کر آہستہ آہستہ
بہت پہلے کہیں دل کوچ کر جاتا ہے بستی سے
بندھا کرتا ہے سامان سفر آہستہ آہستہ
سنا ہے چاند پر بھی بستیاں آباد ہوتی ہیں
بسیں گے جاکر آکاش پر آہستہ آہستہ
زمانہ برق رفتاری کا ہے پھر دل کے لٹنے کا
خبر ہوگئی ہے اے خبر آہستہ آہستہ
دکھوں کے زیر و بم تو ہمیں مانوس ہونے دو
مزہ لے گا آشفتہ سر آہستہ آہستہ
وساوس کا تمہیں ڈر تھا خدا کے فضل سے دیکھو
ہویدا ہوگیا نور سحر آہستہ آہستہ
راہ اُلفت ہے اُس کو دوڑ کا میدان مت سمجھو
چلو اس راہ پر دل تھام کرآہستہ آہستہ
تمہیں کھویا ہے اتنی بار کے سہا ہوا ہے دل
میرے اندر سے نکلے گا یہ ڈر آہستہ آہستہ
لہو میں کھولتے آتش نشاں کی کیا خبر تم کو
ہوا ہے خاک جل جل کر جگر آہستہ آہستہ
یہ جیون کھیل ہے اور کھیل بھی ہے سانپ سیڑھی کا
نہ ڈر سانپوں سے سیڑھی سے اُتر آہستہ آہستہ
مسلسل تشنگی ہے اور اِذنِ سیرابی بھی نہیں ملتا
وہ کہتے ہیں کلامِ مختصر آہستہ آہستہ
سمجھ لیتی ہوں میں مضمون خط کا بن پڑھے فوراً
میری جانب جب آئے نامہ بَر آہستہ آہستہ
تمہاری کج ادائی سے ہماری جگ ہنسائی سے
محبت بن گئی درد سر آہستہ آہستہ

غزل

اطہر حفیظ فراز

عجب طرح کے لوگ ہیں طبیعتیں بدل گئیں
عنایتوں کے دور میں ضرورتیں بدل گئیں
نہ رات کو قرار ہے نہ دن کو ہی سکون ہے
جو آئے تیرے شہر میں راحتیں بدل گئیں
خیال بھی اس طرح غزل بھی اس طرح
فصاحتیں بدل گئیں بلاغتیں بدل گئیں
میرے جو ہاتھ میں تھما تیر اجو دست خوش نما
وہیں پہ لمحے رُک گئے ساعتیں بدل گئیں
کبھی جودل کے درد تھے اب جہاں کے روگ ہیں
تڑپ اسی طرح سے ہے قیامتیں بدل گئیں
ابھی تو خشت تھی زمیں یہ خوشبوؤں کو کیا ہوا
زمیں ہی بدل گئی کہ بارشیں بدل گئیں
چکور کی تڑپ ہے یہ کہ چاند اُس کے پاس ہو
یہ دور اب نیا سا ہے حکایتیں بدل گئیں

غزل

عاصی صحرائی

آؤ مہتاب تراشیں مہر کی کرنوں سے
رنگا رنگ موتی نکھاریں کوہ کے جھرنوں سے
صبح صادق میں نہاں عرش بریں کے سبھی رنگ
یہی نظارہ جو دائم رہا قرنوں سے
زندگی کو ایک نیا موڑ دکھلائیں مل کر
نفرت دہر کو بچا لیں اپنے بہمانوں سے
علم کی شمع جلائیں محبتیں دے کر
اور مصفیٰ کریں اس دہر کو اذانوں سے
عجز کا پرچم رہے اُونچا سدا اس دنیا میں
یہی اسباق ملیں ہمیں بھی تو پروانوں سے
ساری اُمید ہی وابستہ رہیں تم سے عاصیؔ
تم مطمئن رہو ہمیشہ اپنے، جوانوں سے

غزل

ناصر کاظمی

تیرے آنے کا دھوکا سا رہا ہے
دیا سا رات بھر جلتا رہا ہے
عجب ہے رات سے آنکھوں کا عالم
یہ دریا رات بھر چڑھتا رہا ہے
سنا ہے رات بھر برسا ہے بادل
مگر وہ شہر جو پیاسا رہا ہے
وہ کوئی دوست تھا اچھے دنوں کا
جو پچھلی رات سے یاد آ رہا ہے
کسے ڈھونڈو گے اِن گلیوں میں ناصرؔ
چلو اب گھر چلیں ،دن جا رہا ہے

پندرھویں صدی کے مُلاؤں کی اَقسام

اے آر راجپوت

حضرت رسول اکرم ﷺ کی ایک حدیث کا مفہوم کچھ یوں ہے۔لوگوں پر ایک ایسا وقت آنے والا ہے کہ جب اسلام کے نام کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن محض رسم بن جائے گا اُن لوگوں کی مساجد بظاہر آباد مگر ہدایت سے خالی ہوں گی۔اُن کے علماء آسمان کے نیچے بدترین مخلوق ہونگے۔اُنہی میں سے فتنے اُٹھیں گے اور واپس اُنہی میں لوٹ جائیں گے۔آج رنگا رنگ کے مُلاّؤں کو دیکھ کر جو اسلام کے نام پر قسما قسم کے تماشے کر رہے ہیں دل گواہی دیتا ہے کہ اے پیارے حضور ﷺ آپ نے جو نقشہ کھینچا تھا وہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اور میں شہادت دیتا ہوں کہ واقعی یہ علماء آسمان کے نیچے بدترین مخلوق ہیں۔(درج ذیل تحریر میں حقیقی اسلام کی تعلیم دینے والے علماء مراد نہیں) حضرات! دنیا بھر میں مختلف انواع و اقسام کے مولوی پائے جاتے ہیں آج ہم پاک سرزمین شاد باد میں آباد لوگوں کی گردنوں پر سوار مولویوں کی چند اقسام سے آپ کو روشناس کروائیں گے۔مُلاّں رنگ باز۔میڈیا کی گھر گھر رسائی کے سبب اس قسم نے بڑی شہرت پائی ہے اس کا دوسرا نام ڈرامے باز اور تیسرا شعبدہ باز مولوی ہے۔یو ٹیوب اور دوسرے سوشل میڈیا میں ان کی لغویات، واہیات حرکات وسکنات و پُھرتیات اور ڈرامے دیکھ کر لاکھوں افراد محظوظ ہوتے ہیں۔ان میں مولوی ٹوکا، مولوی کرنٹ، اور مولوی بھنگڑا قابل ذکر ہیں۔چونکہ یہ اقسام عوام میں خاصی شہرت پا رہی ہیں۔اس لئے ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں کچھ اس قسم کی اقسام بھی مارکیٹ میں دستیاب ہوں۔مثلاً مولوی بندوق، مولوی گنڈاسہ، مولوی ایٹم بم، مولوی چُھرا، مولوی راکٹ وغیرہ وغیرہ۔ان کی سب سے گھٹیا قسم وہ ہے جو اپنے مریدوں سے خود کو سجدے کرواتی ہے۔مُلاّں فساد فی سبیل اللہ۔

یہ قسم آج کل بڑی ''اِن'' ہے۔چند روپوں کی خاطر یہ فتویٰ دینے والی بلائیں توہینِ رسالت اور توہینِ قرآن کے متعلق فتوے جاری کرتی ہیں۔اور بے گناہوں کو زندہ جلوا کر یا کبھی پتھر مار مار کر سفا کی کا مظاہرہ کرواتی ہیں۔جائیدادوں اور املاک پر قبضہ، حسد، ذاتی رنجشیں، جھگڑے اور دیگر مسائل سے نپٹنے کے لئے بہت سے لوگ ان سے فائدہ اُٹھا چکے ہیں۔دیگی مولوی۔یہ فسادی مولوی کی ہی ایک قسم ہے۔لوگوں کو مار دھاڑ پر اُکسانے والی یہ مخلوق وقت پڑنے پر داڑھیاں منڈوا کر دیگوں میں گُھس کر جان بچاتی ہے۔جنرل اعظم خاں نے ۱۹۵۳ء میں لاہور میں ہونے والے فسادات کے دوران بڑی تعداد میں ان کو دیگوں سے برآمد کیا تھا۔یہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی پلاننگ بھی بدل رہی ہے۔لال مسجد میں جہاد کی تعلیم دینے والے مولوی صاحب نے دیگ میں چُھپنے کی بجائے برقعہ پہن کر فرار ہونے کی کوشش کی ان صاحب نے متعدد بار گورنمنٹ کو خودکُش حملوں کی دھمکیاں دیں اور کہا کہ شہادت اُن کی آخری خواہش ہے مگر جب وقت آیا تو میدانِ جنگ میں بچوں اور فقط ایک سو بچوں کو چھوڑ کر خواتین کے ساتھ برقعہ پہن کر فرار ہوتے ہوئے دبوچ لئے گئے۔حلوہ مولوی۔یہ میٹھی قسم کے مولوی ہیں انہیں حلوہ کھلا کر جنت تک کا پروانہ لیا جا سکتا ہے افسوس کہ یہ بے ضرر قسم کے مولوی مفقود ہوتے جا رہے ہیں زمانے کی ضروریات کے مدنظر ان کی جگہ نئی ٹائپ کے مولوی اُبھر کے آئے ہیں۔جیسے مولانا ڈیزل، مولانا جج کرپشن وغیرہ۔ان مولویوں کی پہچان ان کی موٹی گردن اور پھیلی ہوئی توند ہے۔

مولوی پینترا۔یہ مولوی بھیس، بیان، چہرے، وفاداریاں اور پینترے بدلنے میں لاثانی ہیں۔ان کے بانی پاکستان بننے کے سخت مخالف تھے۔قائداعظم اور ان کے ساتھیوں کی حکومت کو کافرانہ حکومت کہتے تھے۔اور اعلان یہ کرتے کہ پاکستان تو دور کی بات ہے اس کی ہم پ بھی نہیں بننے دیں گے۔پاکستان بننے کے فوراً بعد ۱۸۰ ڈگری کا یوٹرن لے کر پاکستان کے سب سے زیادہ ہمدرد بن کر اُبھرے ان میں سے ایک کا بیان بہت مقبول ہوا کہ۔''ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہ تھے''۔یہ عظیم مفتی ۱۹۷۴ء کی اسمبلی کے روحِ رواں تھے۔چنانچہ انہوں مولانا ڈیزل، جو اپنے والد محترم کا نام آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ان کی اکثریت امریکہ کے خلاف رہی مگر تعجب ہے کہ اس گناہ میں شریک ہمارے آباہ واجداد سے انتقام اس رنگ میں لیا کہ کہ آج بھی ہماری گردن پر سوار ہیں۔ان کی اولاد میں سے ایک مولانا کی اولاد امریکہ میں ہی تعلیم حاصل کرتی ہے اور وہیں پر مستقل رہائش رکھتی ہے۔ان کو علاج کے لئے بھی امریکہ ہی کے ہسپتالوں میں جانا پڑتا ہے اور افسوس کہ ان کی موت بھی امریکہ میں ہی ہوتی ہے۔مولوی قصاب۔یہ کسی تعارف کے محتاج نہیں گردنیں کاٹنا اُن کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔بچوں کو جنت کے جھانسے دے کر اُنہیں خودکُش جیکٹس پہناتے ہیں مولویوں میں سب سے خطرناک اور درندہ صفت ہیں۔ان کو طالبان کے نام سے جانا جاتا ہے، ان کا نِک نیم مولوی بمبار بھی ہے ہزاروں بے گناہ بچوں کو، مردوں کو، عورتوں اور بوڑھوں کو موت کے گھاٹ اُتار چکے ہیں۔ان پر زیادہ لکھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔مولوی چونکہ چنانچہ لیکن۔یہ مولوی میڈیا پر آ کر طالبان کی مذمت کرتے ہیں مگر ساتھ ہی ''چونکہ، چنانچہ، لیکن، پس، لہٰذا ثابت ہوا جو کروا رہا ہے امریکہ کروا رہا ہے'' کے بھاشن سناتے ہیں قصاب مولویوں کی کامیابی انہی کی مرہون منت ہے۔انہوں نے عوام کو ایسا اُلجھا رکھا ہے کہ آج تک اُنہیں سمجھ نہیں آئی کہ ان کا اصل دُشمن کون ہے۔معاشرے کی اصلاح کے نام پر ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے والے یہ خدائی فوجدار اپنی ہر ناکامی پر، برائی یا گناہ کا سہرہ یہودیوں،

امریکنوں، ہندوؤں اور دوسرے اہل مغرب کے سر باندھتے ہیں۔انہی اقسام میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو بچوں کے ساتھ بدفعلی کرکے ان کا گلا گھونٹ کر قتل کرتے ہیں پھر اُن کا جنازہ بھی خود پڑھاتے ہیں۔اور جب پولیس پکڑ لے تو شرمندہ ہوکر کہتے ہیں کہ مجھ سے ایسا شیطان نے کروایا۔مولوی وارنٹ۔ایسے مولوی کو اگر کسی سوال کا جواب نہ آئے تو سوال پوچھنے والوں کے لئے کفر کا وارنٹ جاری کرتے ہیں۔

نہایت ڈھٹائی سے معصوموں کے لئے جہنم اور موت کے وارنٹ جاری کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔مُلاں آن لائن۔ان کی شکلیں دیکھ کر تے آتی ہے۔ٹی وی پر آکر ایسی جاہلانہ حرکات کرتے ہیں کہ الامان الحفیظ۔یہ ٹی وی پر آکر کبھی وظیفے بتاتے ہیں۔تو کبھی استخارہ کرتے ہیں۔کبھی مخالف مسلک رکھنے والوں کے قتل عام کرنے کا فتویٰ جاری کرتے ہیں مساجد اور خدا کے نام پر لوگوں سے پیسے بٹورتے ہیں۔پہلے یہ اپنے مدرسوں کے بچوں سے بسوں میں بھیک منگواتے تھے۔یا پھر مساجد کے لاؤڈ سپیکرز کے ذریعے چندہ مانگا کرتے تھے اب ٹی وی پر بنفسِ نفیس، کئی کئی مرلوں کے تھوبڑے لے کر پچاس پچاس پونڈز مانگتے نظر آتے ہیں۔جنوں والا مولوی۔یہ جن نکالنے اور جان نکالنے کے ماہر ہوتے ہیں۔کئی عشروں سے لوگوں کو بیوقوف بنایا ہوا ہے۔سینکڑوں کی تعداد میں رنگے ہاتھوں پکڑے بھی جاتے ہیں مگر جاہل عوام انہیں جعلی پیر کہہ دیتی ہے۔مُلّاں کلین شیو۔یہ جدید قسم ہے چہرے پر داڑھی اور بعض دفعہ مونچھ بھی نہیں ہوتی۔سنا ہے کہ اُن کے پیٹ میں داڑھی ہوتی ہے۔ضیاء الحق کو اس نسل کا بانی مانا جاتا ہے۔جن کی باقیات میں سے کلاشنکوف و ہیروئن کلچر، منافقت، شدت پسندی، کٹھ ملائیت اور نواز شریف یادگار ہیں۔(ماخوذ)

غزل۔

احمد منیبؔ

بدن بدن داغ داغ رکھنا
بس اپنا اپنا دماغ رکھنا
ہجومِ یاراں میں کھو نہ جانا
مرے لہو کا سراغ رکھنا
مرے مقدر کے تخت پر بھی
محبتوں کے ایاغ رکھنا
ہر ایک دھڑکن شمار کرنا
کلی کلی باغ باغ رکھنا
مرے خدا کا ہی حوصلہ ہے
قدم قدم پہ چراغ رکھنا

شاعر ہونا کیا معنی رکھتا ہے
مصور رنگوں سے اور شاعر الفاظ سے کھیلتا ہے

رشید صدیقی

سیدھا سا جواب ہے کہ کوئی معنی نہیں رکھتا گو معنی نہ رکھنا بھی بعضوں کے نزدیک بڑی پُر معنی بات ہے ایسوں سے نباہ بڑا مشکل ہے لیکن ان میں مجھ میں اتنا فاصلہ ہے کہ خواہ مخواہ ڈرنے کے بھی کوئی معنی نہیں۔شاعری کی تقسیم بڑی مشکل ہے اس کو جنس کے اعتبار سے تقسیم نہیں کر سکتے اس لئے کہ اس کی جنس ہمیشہ مشتبہ رہی ہے، جوان بوڑھوں کے اعتبار سے بھی تقسیم نہیں کر سکتے کیونکہ آج کل شاعر منہ زور ہونے کے اعتبار سے جوان، اور خیالات سے بوڑھا اور اعمال کے اعتبار سے کچھ غیر جانب دار سا ہوتا ہے اور یہ حالات ایسے نہیں ہیں کہ ان پر اعتماد سے کر کے آپ کا وقت ضائع کیا جائے۔ایک تقسیم جثے اور حلیے کے اعتبار سے کی جاسکتی ہے لیکن ان میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ آپ کے ہر جثے اور حلیے کے شاعر ملیں گے۔ایسے شاعر بھی پائے جائیں گے جن میں عرض وطول ہے حجم نہیں اور ایسے بھی ہیں جن میں حجم ہی حجم ہے طول وعرض کا گزر نہیں معلوم نہیں آپ آئن سٹائن کے مشہور نظریہ اضافت سے واقف ہیں یا نہیں یہ اس لیئے پوچھ رہا ہوں کہ میں خود واقف نہیں ہوں آپ بھی واقف نہ ہوں تو بڑی سہولت ہوگی یعنی نظریہ تو رہا ایک جگہ ہم آپ ایک دوسرے سے خوب واقف ہو جائیں گے۔آئن سٹائن کے نظریے کے ضمن میں یہ بات بتائی جاتی ہے کہ فاصلے اور رفتار کے اعتبار سے طول وعرض کا تصور بدل جاتا ہے چنانچہ آپ نے بعض ایسے شاعر بھی دیکھے ہوں گے جو اپنے اشعار کچھ ایسے دُھن سے پڑھتے ہیں کہ آپ ان کی صحیح رقبے کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

میں نے ایک شاعر کو غزل کچھ اس طرح پڑھتے دیکھا ہے کہ گویا غزل کہ معنی عورتوں سے بات کرنے کے نہیں بلکہ 18 انجنوں پر دانت پیسنے کے ہیں۔اچھا آیئے ذرا سنجیدگی سے اس مضمون کی تقطیع کر ڈالیں یہ کوئی اندایشہ ناک بات نہیں بشرطیکہ سنجیدگی اپنی ہو اور تقطیع دوسروں کی۔۔دنیا میں ہر شخص کھلونوں سے کھیلتا ہے، کھلونوں اور کھلاڑیوں کا شمار نہیں۔شاعر الفاظ سے کھیلتا ہے مصور رنگ اور خط سے مجسمہ تراش پتھر سے رقص حرکت سے لیڈر جہلا سے، یونیورسٹیاں تعلیم یافتوں سے تعلیم یافتہ بیکاری سے، بیکار انقلاب سے انقلاب زندہ آباد سے۔خود الفاظ کی دنیا بھی دلچسپی سے خالی نہیں اور اس میں ہمارے شاعر کو بہت کچھ دخل ہے الفاظ کی اہمیت اب اتنی بڑھ گئی ہے کہ ''تعزیرات ہند'' اور نقش سلیمانی دونوں کا مدار اسی پر ہے۔قانون اور تعویذ سے کون محفوظ رہ سکتا ہے۔تعزیرات ہند کی رو سے سزا ملتی ہے۔نقش سلیمانی سے محبوب۔الفاظ کو معنی سے کیا نسبت اس پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ خود

الفاظ کیسی جامعت نصیب ہے اور ہم آپ اس سے کیسے نت نئے شگوفے کھلایا کرتے ہیں۔شاعر کا سارا کھیل الفاظ کا ہے۔اس کھیل کو ہمارے شعرا نے اتنا کھیلا ہے کہ اب الفاظ میں وہ باتیں پیدا ہوگئی ہیں جو کبھی معنی میں نہیں تھیں۔پہلے معنی کے لئے الفاظ کی تلاش تھی۔اب الفاظ تلاش کر لیجئے معنی خود بخود پیدا ہو جائیں گے۔کبھی معنی کے لئے سرگرداں رہتے تھے بڑی ریاضت بری مشقت کے بعد معنی تک رسائی ہوتی تھی اب الفاظ ہی سب کچھ ہیں ان کو ادھر اُدھر کرتے ہیں ہر قسم کے معنی نکل آتے ہیں جو بچ رہیں گے ان کو سامعین پورا کر دیں گے۔آج کل بیشتر شاعروں کو صرف الفاظ یاد ہیں جن کو ہو جس طرح چاہتے ہیں ترتیب دیتے ہیں۔جو بحروں اور ترکیبوں کے چرخ پر خود بخود الفاظ آتے ہیں جن کو لانے میں شاعر کو کوئی دخل نہیں معنی سامعین کی شعریت خود بخود ہی پیدا کر لیتی ہے سننے والوں میں بھی شاعر موجود ہوتا ہے یہاں شاعر سے مراد کوئی خاص شخص نہیں ہے جس کا ایک تخلص ہو یا خاص طرح کا حلیہ یا مشتبہ قسم کی صحت بلکہ شعریت ہے، جو سننے والے میں موجود ہوتی ہے۔حقیقی شاعر اپنے سامعین کے دل و دماغ کے تاثرات کو بھی اپنے جذبات یا تخلیات کو جزو بنالیتا ہے۔ایسا نہ ہو تو پھر کسی دوا ساز یا شاعر میں فرق کیا رہ جائے، وہ ہمیشہ چند ادویات ملا کر عرق سفوف یا معجون تیار کر سکتا ہے آپ نے ایسے شاعر بھی دیکھے ہوں گے جو شاعر نہیں صرف دوا ساز ہوتے ہیں۔دیکھتے غزل ہی نہیں بلکہ ایک نشست میں پورا دیوان مرتب کر دیں گے۔ان کے اشعار ملکہ شعر بازی کے اتفاقی یا میکانکی نتائج معلوم ہوتے ہیں۔اب تصور کیجئے ایسے شاعر کا جسے اطلاع ملی کہ فلاں مقام پر مشاعرہ ہونے والا ہے اور مصرعہ طرح ہے فرض کر لیجئے وہ ایسے خوش قسمتوں میں سے نہیں جس کو تیسرے درجے کا بھی سفر خرچ مل سکتا ہو وہ دنیا کا ہر کام چھوڑ کر مصرع طرح پر زور لگانا شروع کرے گا۔اس درمیان اس کو مطلق یہ فکر نہ ہوگی کہ بیوی بچوں کے لئے پیٹ بھرنے کو روٹی اور تن ڈھکنے کو کپڑا بھی میسر ہے یا نہیں۔نہ دن کو دن سمجھے گا نہ رات کو رات۔بھوک پیاس سے کوئی علاقہ نہیں دوست دشمن سب بے نیاز۔تخیل کے زور سے آسمان پر چڑھتا اور پاتال میں اُترتا ہوگا۔عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کرتا ساحل کو سفینہ اور سفینے کو ساحل سے اور دونوں کو سبک ساران ساحل سے ٹکراتا پھر اپنے کرائے کے مکان میں آجاتا ہے جہاں اس کی غزل تیار ہو رہی ہے اور بیوی بچے فاقے کر رہے ہیں۔

یہ کتابیں یہ رسالے

سید کاشف رضا

خالد معین کی بنیادی شناخت ایک شاعر کی ہے۔لیکن ایک شاعر مبتلا سے یہ امید نہیں تھی کہ کہ ایک روز جم کر بیٹھے گا اور اپنی تیس پینتیس برسوں کی لخت لخت یادوں کو یوں جمع آوری کرے گا کہ اب جوان کی کتاب رفاقتیں کیا کیا دیکھی تو معلوم ہوا کہ جس کام کا بیڑا انہوں نے اُٹھایا وہ ان کے سوا کوئی اور اس خوبی سے کر بھی نہیں سکتا تھا۔تفضیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ کتاب صرف خالد معین کی ہی یادوں پر مشتمل نہیں بلکہ اس کے ذریعہ پورا ایک عہد جیتا جاگتا ہمارے سامنے آجاتا ہے۔مصنف نے اس کتاب میں پہلے تو پنے خاندان سے قسم قسم کے کردار نکال کر ہم سے تعارف کرائے ان کرداروں کا ادبی دنیا سے براہ راست تعلق نہیں مگر ان کی بھرپور شخصیت کو مصنف نے بڑی چابک دستی سے گرفت میں لیا ہے۔

دوستوں کے درمیاں چہکنے والے خالد معین نے اپنی ابتدائی زندگی میں ماں اور پھر بہن کی وفات کی جانکاہ صدموں کا ذکر کیا ہے۔اور پھر ماضی قریب میں والد اور اپنے شریک حیات کی بیماری اور پھر وفات کی جاں گسل لمحات کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ان تحریروں میں ان کا درد بہت نمایاں ہے۔ان کی ایک مختلف شخصیت سامنے آتی ہے دردمند دل رکھنے کے باوجود ایک حوصلے والے آدمی کی شخصیت۔کتاب ہمیں ان کے بچپن اور لڑکپن کے دوست اپنے بھرپور شخصیتوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔اپنے ابتدائی زمانے کے ان دوستوں کو بھی انہوں نے پوری طرح یاد کیا ہے جنہیں شعروادب سے شغف تھا لیکن پھر وہ کارزندگی میں ایسے مشغول ہوئے کہ ادب سے بھرپور وابستگی قائم نہ رکھ سکے۔انہوں نے ان دوستوں کو بھی یاد کیا۔جنہوں نے اونچی اُڑان بھری اور اب ملکی سطح پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ان کے جو دوست شاعر تھے ان کی شاعری کا یک عمدہ انتخاب بھی مصنف نے فراہم کیا ہے۔اس انتخاب میں د وخوبیاں ہیں۔ایک تو کراچی میں پچھلے تیس برسوں میں سامنے آنے والے شعراء کے منتخب انتخاب اور نظموں کے ٹکڑے ایک ہی جگہ سامنے آگئے ہیں اور دوسری خوبی یہ ہے کہ کچھ ایسے شاعروں کا تذکرہ بھی اس کتاب میں شامل ہے جو ادبی سماجیات میں ماہر نہ ہونے اور دیگر وجوہات کی بنا پر ادب کی آگے کی صفوں میں دکھائی نہیں دیتے۔یہ کتاب بنیادی طور پر کراچی میں پچھلے تیس سال کے دوران مصنف کی گزر بسر۔ان کی محفلوں شب بیداریوں اور دوستیوں کا احاطہ کرتی ہے۔اپنے لڑکپن اور جوانی میں وہ اور انکے دوست جب معاش کی جدو جہد کے ساتھ ساتھ رومانی زندگی کا پہلا ساون بھیگ رہے تھے۔تو وہ صحیح معنوں میں ان کے معین تھے۔دوستوں اور دوستیوں کو سینت سینت کر رکھنا کوئی آسان کام نہیں۔خاص طور پر شعروادب سے وابستہ شخصیات کی نفسیاتی مدوجزر پر کسی بھی قسم کی تعلق کی کشتی کو کھینا ایک مشکل کام ہوتا ہے۔مگر وہ اپنی

تہذیبی شرافت اور مروت کے سبب یہ کام بظاہر آسانی سے کرتے دکھائی دیتے ہیں اس مشکل کو سہل کرنے میں ان کی اس خاصیت نے بھی اہم کردار ادا کیا ہوگا وہ اپنے اردگرد موجود کرداروں کو پوری ہمدردی اور توجہ سے جاننے کی کوشش کرتے اور ان کی انفرادی مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کتاب میں پروف کی غلطیاں نکال دی جائیں اور ایسے حواشی مرتب کر دئے جائیں جن کے ذریعہ کتاب میں موجود ناموں کو متعلقہ صفحات پر تلاش کیا جا سکے تو اور بھی بہتر ہوگا۔ خالد معین جیسی جزری سے مختلف کرداروں کا مطالعہ کرتے ہیں پھر اسے جس لسانی گرفت کے کے ساتھ تحریر کرتے ہیں اس سے پتا چلا کہ ان کے اندر ایک عمدہ خاکہ نگار بھی چھپا بیٹھا ہے۔

شعراء کے لطائف

عبدالقدیر کوکب

☆۔ایک مولوی صاحب نے سرسید کو خط لکھا کہ معاش کی طرف سے بہت تنگ ہوں، عربی جانتا ہوں، انگریزی سے ناواقف ہوں، کسی ریاست میں میری سفارش کر دیں۔ سرسید نے جواب دیا کہ ''سفارش کی میری عادت نہیں اور معاش کی تنگی کا آسان حل یہ ہے کہ میری تفسیرِ قرآن کا رد لکھ کر چھپوائیں، کتاب خوب بکے گی اور آپ کی تنگی دور ہو جائے گی''

☆۔ایک دن خواجہ الطاف حسین حالی کے پاس مولوی وحیدالدین سلیم (لٹریری اسسٹنٹ سرسید احمد خان) بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص آیا اور مولانا حالی سے پوچھنے لگا۔''حضرت، میں نے غصہ میں آ کر اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ تجھ پر تین طلاق، لیکن بعد میں مجھے اپنے کیے پر افسوس ہوا، بیوی بھی راضی ہے مگر مولوی کہتے ہیں کہ طلاق پڑ گئی، اب صلح کی کوئی شکل نہیں، خدا کے لیے میری مشکل آسان فرمائیں اور کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ میری بیوی گھر میں دوبارہ آباد ہو سکے۔''

ابھی مولانا حالی کوئی جواب نہیں دینے پائے تھے کہ مولوی سلیم اس شخص سے کہنے لگے۔''بھئی یہ بتاؤ کہ تو نے طلاق 'ت' سے دی تھی یا 'ط' سے؟ اس شخص نے کہا۔''جی میں تو ان پڑھ اور جاہل آدمی ہوں، مجھے کیا پتہ کہ ت سے کیسی طلاق ہوتی ہے اور ط سے کیسی ہوتی ہے''۔ مولوی صاحب نے اس سے کہا کہ "میاں یہ بتاؤ کہ تم نے قرات کے ساتھ کھینچ کر کہا تھا کہ ''تجھ پر تین طلاق'' جس میں ط کی آواز پوری نکلتی ہے یا معمولی طریقہ پر کہا تھا جس میں ط کی آواز نہیں نکلتی بلکہ ت کی آواز نکلتی ہے۔''بیچارے غریب سوال کنندہ نے کہا۔''جی مولوی صاحب، میں نے معمولی طریقہ پر کہا تھا، قرات سے کھینچ کر نہیں کہا تھا'' یہ سننے کے بعد مولوی سلیم صاحب نے پورے اطمینان کے ساتھ اس سے کہا۔''ہاں بس معلوم ہو گیا کہ تو نے ت سے تلاق دی تھی اور ت سے کبھی طلاق پڑ ہی نہیں سکتی، ت سے تلاق کے معنی ہیں آ محبت کے ساتھ مل بیٹھ، تو بے فکر ہو کر اپنی بیوی کو گھر لے آ، اور اگر کوئی مولوی اعتراض کرے تو صاف کہہ دیجو کہ میں نے تو تت سے تلاق دی تھی ط سے ہرگز نہیں دی۔''

☆۔حفیظ جالندھری سر عبدالقادر کی صدارت میں انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں چندہ جمع کرنے کی غرض سے اپنی نظم سنا رہے تھے۔ جلسے کے اختتام پر منتظم جلسہ نے بتایا کہ 300 روپیہ جمع ہوئے۔ حفیظ نے مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ میری نظم کا اعجاز ہے۔''لیکن حضور!'' منتظم نے متانت سے کہا،''200 روپیہ ایک ایسے شخص نے دئے ہیں جو بہرا تھا۔''

☆۔کچھ نقاد حضرات اردو کے ایک شاعر کی مدح سرائی کر رہے تھے، ان میں سے ایک نے کہا۔صاحب کیا بات ہے، بہت بڑے شاعر ہیں، اب تو حکومت کے خرچ سے یورپ بھی ہو آئے ہیں۔''ہری چند اختر نے یہ بات سنی تو نہایت متانت سے کہا۔''جناب اگر کسی دوسرے ملک میں جانے سے کوئی آدمی بڑا شاعر ہو جاتا ہے تو میرے والد صاحب ملکِ عدم جا چکے ہیں لیکن خدا گواہ ہے کہ کبھی ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکے۔''

دُم دار ستارے دلچسپ حقائق

فراز حمید خان

سائنس والوں کا خیال ہے کہ 6.4 ارب سال پہلے نظام شمسی نظام وجود میں آیا تو سیاروں کی تشکیل کے بعد بچ جانے والی گیس، گرد، برف اور چٹانوں سے دم دار ستارے وجود میں آ گئے۔ دُم دار ستاروں کا مرکزی حصہ برف اور گرد پر مشتمل ہوتا ہے جب کہ ان کی لمبی دُم گرد سے تشکیل پاتی ہے۔ دُم دار ستاروں کے مرکز میں علاوہ منجمد ایمونیا، کاربن مونو آکسائیڈ، کاربن مونو آکسائیڈ، میتھین اور چٹانیں پائی جاتی ہیں۔ دُم دور ستاروں کی دُم دھوپ سے ہونے والی تاب کاری کی وجہ سے وجود میں آتی ہے۔ بعض دفعہ سائینس دانوں نے مفروضہ کیا ہے کہ زمین پر پانیکسی دُم دار ستارے سے زمین پر ٹکراؤ کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔ ہر اگست میں شہاب ثاقب کی بوچھاڑ زمین پر دکھائی دیتی ہے جسے دی پرسیڈ (Perseid The) کہا جاتا ہے۔ یہ بوچھاڑ تب ہوتی ہے جب زمین سورج کے گرد گھومتی ہوئی سوئفٹ ٹٹل نامی دُم دار ستارے کے پاس سے گزرتی ہے۔ (روزنامہ دنیا 2 نومبر 2014ء)

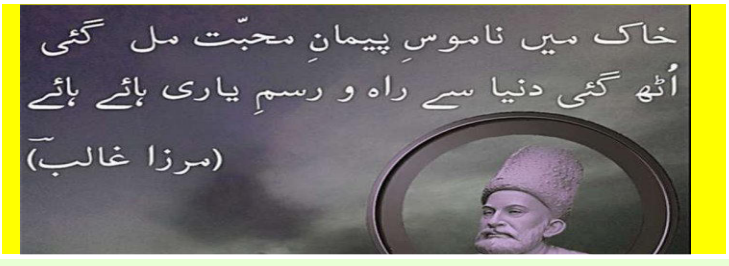

حلیم کے متعلق گستاخی

عاصی صحرائی

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ حلیم کو کسی اور نام سے پکارا جائے کیونکہ ''حلیم'' اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے۔ اور حلیم بنانے کے ساتھ اس لفظ کا استعمال گستاخی کے زمرے میں آتا ہے۔ امید ہے کہ وہ اپنے مقدمات کے لئے وکیل تو نہیں کرتے ہونگے کہ انسان کو ''وکیل'' کیسے کہا جاسکتا ہے؟۔ اور یا پھر وہ وکیلوں کے بارے میں مشہور ترین شعر سے اتفاق نہیں کرتے ہونگے۔ ''حکیم'' سے دوا بھی نہیں لیتے ہونگے کہ انسان حکیم کیسے ہوسکتا ہے؟

نہ تو اُن کے بچے مدرسوں میں اوّل آتے ہونگے اور نہ ہی ان کے پاس ''آخر'' میں کچھ ''باقی'' رہ جاتا ہوگا۔

کیونکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں۔ مرنے کے بعد اُن کا کوئی ''ولی'' بھی نہیں ہوتا ہوگا۔ کیونکہ انسان ولی کے درجے پر کیسے پہنچ سکتا ہے؟ 'یہ متقیان یقیناً مقبوضہ کشمیر میں ''قابض'' انڈین فوج کو قابض بھی نہیں کہتے ہونگے۔ ساڈی ''باری'' آن دیو کا نعرہ بھی ان کو کفر لگتا ہوگا۔ انہی اصولوں کی بنیاد پر لطیفہ گوئی بھی بے ادبی کے زمرے میں آتا ہوگا۔ اور ملک صاحب کہنا تو سیدھا سیدھا کفر ٹھہرے گا، لفظ ''مصور'' کے لئے تو کوئی فتویٰ لینے کی ضرورت نہیں۔ کسی صحابی یا ولی اللہ کو جلیل القدر کہنا شرک ٹھہرے گا۔ اور شہید کا لفظ انسانوں کے لئے متروک ٹھہرے گا۔ کسی کو عظیم کہنے پر بالکل پابندی ہوگی۔ اور مقتدر قوتیں کہنے پر تعزیر جاری ہوگی۔

کوئی انسان کسی کا والی وارث نہیں کہلائے گا کیونکہ یہ دونوں ہی اسمائے الٰہی ہیں ظاہر و باطن بھی انسانوں کے لئے ممنوع ہونگے۔ کوئی عمل یا کاروبار نافع نہ ہوگا اور نہ کوئی مسجد یا کتاب ''جامع'' کہلائے گی۔ بیشتر اُردو شاعری کو دریا بُرد کرنا پڑے گا۔ کیونکہ ناہنجار شعراء نے ''رقیب'' کی بے شمار برائیاں کی ہیں جو کہ اس نئے اسلامی نظام کے بالکل خلاف ہے۔ اسی طرح کوئی کام ''موخر'' کیا جاسکے گا اور نہ ہی کسی برائی کرنے والے کو ''منتقم'' مزاج کہنے کی اجازت ہوگی۔ یہاں ایک مسئلے پر غور کرنے کی ضرورت پڑے گی کہ عالم اسلام عرصہ دراز سے حضرت عثمانؓ کو ''غنی'' لکھ رہے ہیں۔ اب تمام کتب کو کیسے دُرست کیا جاسکتا ہے جن میں آقائے دو جہاں نے اپنے عم زاد صحابی اور دامادؓ کو ''علی'' پکارا۔ یہ نہ تو اب تک ربّ کائنات کی بے ادبی ٹھہرا اور نہ ہی موجب شرک ٹھہرا۔ اب یہاں اس نئے فہم اسلام کو کیسے نافذ کیا جائے گا۔

(ماخوذ)

دنیا کو بدلنے والی ایجادات

اعزاز لطیف خان

چیونگم سے مسوڑوں کا علاج:

اس وقت دنیا بھر میں چار ارب کے لگ بھگ افراد مسوڑوں اور دانتوں کے مختلف امراض کا شکار ہیں، جن کا علاج نہیں ہو پاتا اور اس کا حل ہے، سویٹ بائٹ نامی ایک چیونگم۔ یہ ایک روغن زیلی ٹول کی مدد سے دانتوں کو صاف اور امراض سے بچائے گی۔ یہ نہ صرف منہ کی صحت کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

ماؤتھ گارڈ:

دماغی صدمے کا پتہ لگانا کافی مشکل ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں کھلاڑیوں کو زندگی بھر کے دماغی نقصان کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے مگر جاپانی ماہرین کے تیار کردہ ماؤتھ گارڈ میموری میں ایسے سنسر لگائیں گئے ہیں جو کھلاڑیوں اور کوچز کو کسی ٹکر یا چوٹ کے نتیجے میں دماغی صدمے سے آگاہ کریں گے۔

شمسی چولہا:

ترقی پذیر ممالک میں کھانا پکانے کے لیے بڑی مقدار میں مہنگے ایندھن کی ضرورت پڑتی ہے جو مضر صحت دھواں بھی پیدا کرتے ہیں مگر انفنٹینی بیکرے نامی شمسی چولہا اس کا بہترین متبادل ہے جو توانائی کی بچت کے ساتھ امراض کا خطرہ بھی کم کرتا ہے اور اپنی کم لاگت کے باعث اس کا خرچہ اٹھانا بھی کم آمدنی والے خاندانوں کے لیے آسان ہے۔ شمسی توانائی سے کام کرنے والا یہ چولہا، ری سائیکل تیل کے ڈرمز، لکڑی، بانس وغیرہ سے مقامی طور پر بہت جلد تیار کیا جاسکتا ہے۔

لیکیج پروف پائپ:

ہر سال دنیا بھر میں پائپوں سے پانی کے رساؤ کے باعث اربوں ڈالرز کا پانی ضائع ہوجاتا ہے مگر اسمارٹ پائپ ٹیکنالوجی اس کا حل بن کر سامنے آئی ہے جو ابھی تیاری کے مراحل میں ہے مگر یہ بغیر سنسر کے بھی سرکاری پانی کے نظام میں لیکج کی مانیٹرنگ کرکے پانی کے استعمال کو زیادہ موثر بنائے گی۔

کھانے کے غذائی مواد کا اسکین:

ڈبہ بند خوراک میں بھی غذائیت کے بارے میں جو معلومات دی جاتی ہے اس میں درحقیقت کچھ زیادہ سچائی نہیں ہوتی۔ مگر اسکیو نامی ایک جیب میں آجانے والا اسپیکٹومیٹر کھانے میں کیلیوری اور کیمیائی مواد کی جانچ کرکے درست معلومات فراہم کرے گا۔

حیرت انگیز شاور:

شاور بڑی مقدار میں پانی ضائع کرتے ہیں جبکہ ان کے لیے بڑی مقدار میں

توانائی کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔صرف امریکہ میں سال بھر میں شاور کے ذریعے ایک اعشاریہ دوٹریلین گیلن پانی استعمال کر دیا جاتا ہے مگر اورب سیز نامی شاور پانی کے استعمال میں نوے اور توانائی کے استعمال میں اسی فیصد تک کمی کا وعدہ کرتا ہے۔یہ ری سائیکل شاور پانی کو اپنے فلٹر کے اندر بند دائرے کے ایک نظام کے ذریعے دوبارہ صاف کر کے استعمال کے قابل بناتا ہے اور اگر اس کو بڑے پیمانے پر استعمال کیا جائے تو پانی اور توانائی کے استعمال میں ڈرامائی کمی لائی جاسکتی ہے۔

سائیکل کا برقی پہیہ:

دفتر یا اسکول جانے کے لیے سائیکل کا استعمال کافی جسمانی محنت کا کام ہوتا ہے اور ان افراد کے لیے زیادہ موزوں نہیں جو کاروباری شخصیت یا طویل فاصلے کا سفر کرتے ہوں مگر اب اسمارٹ نامی ایک سائیکل کا پہیہ کسی بھی سائیکل میں استعمال کیا جاسکے گا جس سے ایک پہیے کو موٹرائز کر کے اس کی افادیت کو بڑھا دیا جائے گا، جو جسمانی محنت اور وقت بچانے کے ساتھ مختلف راستوں پر آسانی سے سفر کر سکے گا۔اس پہیے کے ذریعے سائیکل کا سفر تیز رفتار یعنی فی گھنٹہ بیس میل کی رفتار سے طے کیا جاسکے گا جبکہ اسمارٹ فون کے ساتھ کنکٹ کر کے اسے چوری ہونے سے بھی بچایا جاسکے گا۔

(دنیا میگزین 18 اکتوبر 2015ء)

غزل- اطہر شاہ خان جیدیؔ

یہ تیری زلف کا کنڈل تو مجھے مار چلا
جس پہ قانون بھی لاگو ہو وہ ہتھیار چلا

پیٹ بھی پھول گیا اتنے خمیرے کھا کر
تیری حکمت نہ چلی اور ترا بیمار چلا

بیویاں چار ہیں اور پھر بھی حسینوں سے شغف
بھائی تُو بیٹھ کے آرام سے گھر بار چلا

اُجرتِ عشق نہیں دیتا نہ دے، بھاڑ میں جا
لے ترے دام سے اب تیرا گرفتار چلا

سنسنی خیز اسے اور کوئی شے نہ ملی
میری تصویر سے وہ شام کا اخبار چلا

یہ بھی اچھا ہے کہ صحرا میں بنایا ہے مکاں
اب کرائے پہ یہاں سایۂ دیوار چلا

اک اداکار رُکا ہے تو ہوا اتنا ہجوم
مڑ کے دیکھا نہ کسی نے جو قلم کار چلا

چھیڑ محبوب سے لے ڈوبے گی کشتی جیدیؔ
آنکھ سے دیکھ اُسے ہاتھ سے پتوار چلا

افسانہ

فرخندہ رضوی (ریڈنگ)

دیوار

شام ڈھلتے ہی آسمان کی لاجوردی چادر بادلوں کے پردے میں چُھپ جاتی۔سیاہ بادل مغرب کے کناروں سے اُٹھتے اور پل بھر میں ساون اُتر آتا۔پھر موسلا دار بارش روئی کے گالوں کی طرح ہوا کے دوش پر اُڑنے لگتی۔سبھی جانتے تھے کہ پہاڑی مقامات کا کیا بھروسہ۔ایبٹ آباد کی خوبصورت شام میں سردی سے لپٹے سڑک کنارے اُگے درخت یوں سمٹے ہوتے جیسے ابھی کسی سے لپٹنے کو بیقرار...اُسے سب یاد تھا جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ پہاڑوں کی پگڈنڈیوں سے ہوتی ہوئی سکول سے واپس لوٹتی تو سردی سے ٹھٹھرتے ہاتھ سُرخ ہوتی ناک سے گھر داخل ہوتی تو ایمان خان اُسے مرچی کہہ کر چڑاتا، وہ منہ پھلائے گھر کے صحن تک چلی آتی اور پھولی پھولی سانس سے اُس پر غصہ کرتی...اور ایمان خان قہقہہ لگاتا باہر نکل جاتا...گھر تو ایک تھا مگر درمیان میں ایک دیوار نے گھر کو دو حصوں میں بانٹ رکھا تھا۔اُسے تو اکثر لگتا صرف اِس دیوار نے گھر کو نہیں رشتوں کو بھی بانٹ رکھا ہے۔ایک طرف یہ لوگ اور دوسری طرف اُسکے چچا کی فیملی رہتی تھی۔اکثر ہی وہ اِس مٹی کی دیوار کا تذکرہ گھر کے بزرگوں سے کرتی تو کوئی معقول جواب نہ پا کر خاموش ہو جاتی۔کائنات کے دو چھوٹے بھائی اور ایک بڑی بہن تھی کُچھ عمر کی چھوٹی اور کُچھ لاابالی پن، گھر والے کسی بات میں اُسے شامل ہی کہاں کرتے مگر وہ بنیادی طور پر ایک ہمدرد لڑکی تھی۔

دُکھ و خوشی کے لمحوں کو فرق سے سمجھتی، اُسکے چچا کے دو بیٹے تھے ایک تو ایمان خاں جو ساتھ رہتا تھا دوسرا بھائی جس کے ساتھ کائنات کی باجی کی شادی ہوئی تھی، وہ یہاں نہیں بلکہ انگلینڈ ہوتا تھا۔وہ جانتی تھی بزرگوں کے حُکم اور رسم و رواج کی سولی چڑھائی گئی تھی۔وجہ صرف یہ رہی کہ اُنکے خاندان اپنی برادری سے باہر شادیاں کرتے ہی نہیں۔کبھی کبھی وہ اِس بات پر اُلجھ سی جاتی کہ باجی کی شادی تو ہو چکی مگر اُسکی باجی ابھی تک اِسی گھر میں کیوں رہتی ہے۔جبکہ اُسکے محلے میں بہت سی لڑکیاں جو باجی کی سہیلیاں تھیں اُن کی شادی بھی ہوئی اور وہ یہاں سے اپنے سسرال چلی گئیں۔اُسکی سمجھ اتنی کم بھی نہ تھی۔اُس نے تو یہ بھی سُن رکھا تھا کہ چچا کا بیٹا تو رضامند ہی نہ تھا مگر گھر والوں کی ضد اور رسم و رواج کے ہتھے چڑھ گیا...پھر ایسے ہی ایک دن باجی کو تانگے کے گھوڑے کی طرح جوت دیا گیا۔جو نصیب لکھ دیئے جائیں کون بدل سکتا ہے۔سُنا ہے مرد پیار کرنے کے بہت کچے ہوتے ہیں، باجی بھی سب جانتی تھی اُس نے تو خاموشی کی مہر لب پر لگا رکھی تھی۔نہ اپنے سسرال والوں سے شکایت نہ اپنے ماں باپ سے...جنہوں نے اتنے نازوں سے پال پوس کر اپنے ہاتھوں دفن کر دیا۔جہاں وہ لوگ رہتے تھے۔اور بھی اُنکے رشتہ دار وہاں آباد تھے۔اُن میں اُسکی ایک دوست سلمیٰ تھی

جس سے ہر بات فراغدلی سے شیئر کرتی..کئی دنوں سے یہی سوال اُسکے دل میں بے چینی پیدا کیے ہوئے تھا۔مگر آج جب دونوں سکول سے واپس آرہی تھیں سویرا ضرورت سے زیادہ ہی چُپ چُپ تھی۔''کائنات !کیا بات ہے کئی روز سے تُم کُچھ اُلجھی اُلجھی ہو ...''

وہ تو جیسے اِسی انتظار میں تھی کہ کوئی آئے اور اِسکے دل کا بوجھ ہلکا کردے۔''ہاں سلمٰی!نہ جانے کیوں اندر کی اُداسیاں چہروں پر اُمنڈ آتی ہیں۔دُکھ جب کروٹیں لینے لگتے ہیں تو بے چینیاں بڑھ جاتی ہیں۔میں بھی ایک ایسی ہی پہیلی میں اُلجھی ہوئی ہوں ...جب رات کو سب سو جاتے ہیں تو اپنی باجی کے بستر سے مجھے سسکیوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں،وہ بہن جو دن بھر لبوں پہ مسکراہٹ سجائے سب کے کام کرتی رہتی ہے مگر رات کا اندھیرا بڑھتے ہی کتنی تنہا ہو جاتی...''''کائنات !بہت سی باتیں وقت ہی سمجھا جاتا ہے دُکھوں کو نام دینے کی ضرورت نہیں پڑتی'' وہ اُسکا مُنہ دیکھتے بولی...''تُم صرف یہ جاننا چاہتی ہو نا؟تمھاری باجی کی شادی بھی ہوئی مگر دوسری لڑکیوں کی طرح اپنے خاوند کے ساتھ اپنے گھر کیوں نہیں گئی۔''''ہاں ایسا ہی ہے۔'' بہت بے چینی سے بولی تب سلمٰی نے کائنات کو سب بتا دیا کہ اُسکے بہنوئی نے ایک شادی انگلینڈ میں بھی کر رکھی ہے...پھر اُسے بھی سب سمجھ آ گیا...اُس دن کے بعد سے اُسے چچا کا گھرانا اور بھی بُرا لگنے لگا...چچی جو ہر وقت ناک پر غصہ لیے پھرتی...باجی اُسکی گھر کا سارا کام کرتی وہ اُسے نوکر کی حیثیت سے زیادہ سمجھتی ہی کب تھی...!

اور اُسکی بیٹیاں بھی عناب کے ساتھ اچھا سلوک روا نہ رکھ سکیں..ہر وقت جلی کٹی سناتی رہتیں..کوئی بھی اُنہیں منع نہ کرتا...اندر ہی اندر عناب دُکھی ہوتی مگر ایک سہارا اُسے زندہ رہنے کا حوصلہ دیتا...وہ تھا ننھا مُنا عجب خان۔جس نے اُسے جینے کا سہارا دے رکھا تھا...ایک بدقسمتی یہ بھی تھی کہ عجب خان...کو اُسکے باپ نے دیکھا تک نہ تھا ...وہ تو شادی کے کُچھ ہفتوں کے بعد واپس لوٹ گیا تھا...ماں باپ کبھی کبھی اتنے خود غرض ہو جاتے ہیں کہ مُعاملات کو سُلجھانے کے بجائے اپنے مفاد سامنے رکھے نا انصافیاں کرتے چلے جاتے ہیں...نہ تو اُسکی چچی نے کوشش کی کہ اُنکا بیٹا اپنی بیوی کو پاس بُلا لے نہ ہی عناب نے اپنے حق کے لیے احتجاج کیا...بس وقت ہی گزرتا گیا...کائنات بھی عمر کے اِس حصے میں پہنچ گئی کہ گھر میں اُسکی شادی کا تذکرہ ہونے لگا ۔ایک دن وہ کالج سے لوٹی تو چچا اور چچی کی فیملی کو گھر اکٹھے جمع دیکھا۔اُسے کُچھ حیرانی ہوئی کیونکہ اِس دیوار کے اُس پار جو نفرتیں پل رہی تھیں اُن سے وہ بخوبی واقف تھی مگر انہونی دیکھ کر چونکے بنا پھر بھی نہ رہی۔پھر ایک عمارت گرنے کا اندازہ اُس وقت ہوا جب اُسے معلوم ہوا کہ کل اُسکا نکاح...ایمان خان ...سے کیا جا رہا تھا...وہ سب خاموشی سے سُنتی رہ گئی۔۔اُس گھر کی دہلیز پر ایک بہن سسکیاں لے رہی تھی...شادی شُدہ ہو کر بھی اکیلے زندگی کا سفر طے کر رہی ہے...اُسی گھر میں ایک اور بیٹی کو قربانی کیلئے تیار کیا جا رہا تھا...سب کے چلے جانے کے بعد وہ بہت چیخی...بہن کے آنسوؤں کی تپش سے سکو پگھلانے کی کوشش کی مگر بے سود...سب کا ایک ہی جواب تھا سب ٹھیک ہے مگر ہم اپنے بزرگوں کی روائیتوں کو نہیں چھوڑ سکتے ۔پھر ایک دِن اُسے ایمان خان کی دُلہن بنا دیا گیا...وہ کائنات...جو ہر لمحہ ہرنی کی طرح چھلانگیں لگاتی اِدھر سے اُدھر اُترتی چڑھتی۔۔اُداس بلبل کی طرح ایک پیڑ کی شاخ پر چپک کر بیٹھ گئی...اُسکے سامنے ویران ویران سے راستے رہ گے...

اُسے لگا آج انتہائی جاذب نظر پہاڑی سلسلے نظروں سے دُور ہوتے جا رہے ہوں...پھر وہ دِن بھی طلوع ہوا جس دن ایمان خان بھی سب کے ساتھ اُسے بھی چھوڑ کر دوسرے مُلک سدھار گیا...وہ کسی سے کُچھ نہ کہہ پائی...کُچھ دن گزرنے کے بعد اُسکی باجی کو پوسٹ کے ذریعے ایک رجسٹری موصول ہوئی جسے کھولتے ہی اس میں لکھے الفاظ اُسکا مُنہ چڑانے لگے۔کیونکہ اُسکے خاوند نے اُسے آزاد کر دیا تھا۔۔اُسے پوچھے بنا...اسے پہلے یہ خوشی تو تھی کہ کم از کم شادی شُدہ کا لقب تو تھا۔۔!! آج طلاق نامہ بھیج کر اُس سے یہ بھی حق چھین لیا گیا۔اتنا بڑا انقلاب آیا کسی نے دُکھ کا اظہار تک نہ کیا ... پھر یہ کیسے اپنے تھے۔۔ایک دوسرے کی جھولی میں خوشیاں نہیں ڈال سکتے۔۔صرف رسمیں نبھانے کیلئے رشتوں کی لڑیاں دروازوں کی دہلیز پر باندھ رکھی ہیں آج کائنات کو اِس دیوار کا مطلب سمجھ میں آنے لگا۔یہ تو صرف اینٹوں کی دیواریں ہیں جنہیں کبھی بھی گرایا جا سکتا ہے مگر ہمارے رسم و رواجات تو اِس دیوار سے بھی زیادہ پُختہ ہیں...جنہیں شاید ہم کبھی بھی نہ گرا سکیں!!!

تحریر فرنود عالم

(ڈی چوک کی بے نور گالم گفتار)

علمائے کرام و مشائخ عظام گالیوں کا ذخیرہ تاریخ کے حوالے کر کے ڈی چوک سے روانہ ہونے کو ہیں۔مجھے گالیوں پر کوئی اعتراض نہیں۔گالیاں تو جوش ملیح آبادی نے بھی دی ہیں۔اور جعفر زٹلی نے تو دل بھر کر دی ہیں۔گالی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی صورت میں لغت میں موجود رہتی ہے۔زبان کے اوپر نہ سہی،زبان کے نیچے ہی سہی،نیچے نہ سہی دائیں بائیں ہی سہی،حضرات کی زبان پر مردانہ گالیاں،اور خواتین کی زبان پر نسوانی گالیاں،،شرفاء کی زبان پر شائستہ گالیاں،من چلوں کی زبانوں پر بے لباس گالیاں،کہیں ملفوف گالیاں،تو کہیں اُدھڑی ہوئی کترنوں جیسی گالیاں،کہیں حریف کی محبت بھری گالیاں،تو کہیں حلیف کی زہر آلود گالیاں،دُشمن گالی دے تو سر پھٹول کی نوبت آجاتی ہے،دوست گالی نہ دے تو تشویش لاحق ہو جاتی ہے،یہ تو زندگی کا جزو لاینفک ٹھہرا۔کون ہے جو اس سے بے نیاز ہے۔

'چوراہا' سے اقتباس

حسن نثار

مذہب اور سیاست:

مولانا فضل الرحمٰن صاحب فرماتے ہیں کہ کتا بھی شہادت کے درجے پر فائز ہو سکتا ہے۔ ذرا تصور کریں اگر یہ بیان کسی عام انسان نے دیا ہوتا تو کتنا بڑا ہنگامہ کھڑا ہو جاتا اور وہ بے چارہ سابق گورنر سلمان تاثیر کی طرح بے موت مارا جاتا پھر ملک سے فرار ہو جاتا اور ہوسکتا ہے کہ سڑک پر پٹرول ڈال کر اسے زندہ جلا دیا جاتا۔ یہ ایک دوسرے کو کچھ نہیں کہتے اور فتوے دوسروں کے لئے رکھ چھوڑے ہیں یہاں ثابت بھی ہو جائے کہ رمشہ جیسی بچی پر جھوٹا الزام لگایا گیا تھا پھر بھی اس ملک میں نہیں رہ سکتی لیکن مولانا ایک کتے کو شہید کو درجہ دے دیں تو بھی کوئی شدید تنقید نہیں ہوتی۔ جب میں 2008 میں انتخاب Cover کرنے گیا ہوتھا تو وہاں کچھ علاقوں میں خودکش حملوں کی خبر چلی تو ایک بنگالی صحافی سے کہا کہ یہ کام آپ کے یہاں بھی شروع ہو گیا تو وہ فخر سے بولا نہیں جناب یہ کام یہاں نہیں چلے گا کیوں کہ دہشت گردوں کے ہمدرد یہاں موجود نہیں اور وہی کچھ ہوا کہ سپریم کورٹ نے بنگلہ دیش کی جماعت اسلامی پر پابندی لگا دی کہ مذہب کے نام پر سیاست نہیں ہوسکتی۔ منور حسن کی جانب سے حکیم اللہ محسود کو شہادت کے رتبے پر فائز کرنے سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ بنگلہ دیش کی سپریم کورٹ نے کیوں جماعت اسلامی کو بین کیا تھا اور کیسے مذہب کے نام پر ہونے والی سیاست سے تباہ ہوتے ہیں۔

آبادی اور ہمارے خواب

آبادی کی بڑھوتری کی رفتار 600 بچے فی گھنٹہ یا 14,400 بچے فی دن ہے۔

یہ بچے دودھ بجلی پانی دوا تعلیم معالجہ کپڑے مانگیں گے تو کیا انہیں نسیم حجازی کے ناول پڑھاؤ گے؟ اقبال کی شاعری سناؤ گے؟ وعظوں سے اُن کے پیٹ بھرو گے؟ جالب کی شاعری سے اُن کے علاج کرو گے؟ گلیوں میں رینگتے اور غلیظ نالیوں میں سویمنگ کرتے ہوئے ان ''شاہینوں'' میں سے صاف ستھرے نظم ونسق کے عادی، مہذب، ایماندار فرض شناس اور محنت شاقہ کرنے والے کہاں سے لاؤ گے؟ ہم مبالغہ کا بطور آکسیجن کے استعمال کرتے ہیں مغالطہ کا مشروب پیتے اور مسخ شدہ تاریخ کھاتے ہیں اس لئے ہماری ہر خرابی ناکامی اور گندگی اور نالائقی کے ذمہ دار یہود و نصاریٰ ہیں۔

جسم دماغ اور رُوح:

فرد کی تہذیب کے تین مرحلے، تین مقام، تین درجے، تین حصے اور تین خانے ہوتے ہیں۔ اوّل جسم، دوم دماغ، سوم رُوح۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ معاشرہ صرف اور صرف ''جسم'' رہ گیا ہے اور وہ بھی مفلوج، معذور اور مختلف امراض میں جکڑا ہوا جسے نہ کوئی ڈاکٹر میسر ہے نہ دوا بلکہ کبھی کبھی تو سوچتا ہوں کہ شاید اس ''جسم'' میں صحت مندی کی خواہش بھی باقی نہیں بچی۔ اسے کسی ڈاکٹر دوا یا علاج سے دلچسپی ہی نہیں۔ Death Wish یعنی خواہش مرگ میں مبتلا ''جسم'' ہے جبکہ صرف جسم تو جانور کیا جراثیم کا بھی ہوتا ہے۔ انسان فقط ''جان دار، جانور'' سے انسان تب تبدیل ہوتا ہے جب اس کا دماغ متحرک ہو جو بتدریج رُوح کے تحرک تک جا پہنچے اور یہی وہ مقام ہے جہاں بڑا ادب، آرٹ اور ایجاد جنم لیتے ہیں۔ جس معاشرہ میں صرف جسم کو پالنے میں ہی زندگی گزر جائے، اس استحصالی معاشرہ میں انسان جسموں سے آگے بڑھنے ہی نہیں پاتا۔ جہاں مقصدِ حیات ہی صرف دو وقت کی روٹی رہ جائے، وہاں خوبصورتی، حسن، لطافت، پاکیزگی، خوشبو، تربیت، تنظیم، تعمیر، تخلیق، توازن کا کیا کام؟

ہم اور ہماری ترجیحات:

کیا کوئی تصور کرسکتا ہے کہ کسی انسانی معاشرے میں ایسا کوئی کوکنگ آئل بکتا ہو جسے مردہ جانوروں کی آنتڑیوں سے تیار کیا جاتا ہو۔ اس انحطاط کو بیان کرنے کے لئے الفاظ بھی نئے ہی ایجاد کرنا ہوں گے۔ ہر بار جب بھی کسی انتہائی ناخوشگوار اور بدبودار نئی حرکت کا انکشاف ہوتا ہے تو میں سوچتا ہوں.....بس یہ تو ''The end'' ہو گیا لیکن چند ہی ہفتوں کے اندر اندر کوئی ایسی نئی نجاست سامنے آتی ہے۔ جعلی دودھ کی خیر ہے، تیزاب میں ڈال کر پھیلا گیا لہسن بھی ٹھیک ہے، کیمیکل میں ڈبو کر ادرک کا وزن اور اس کی چمک بڑھانا بھی درست ہے، مین ہول چوری کر کے فونڈریوں کو بیچنا بھی صحیح ہے، مسجد کی ٹوٹیاں، فون و بجلی کی تاریں چرانا بھی سمجھ آتا ہے، ارب پتیوں کا گیس، بجلی، ٹیکس پر ڈاکہ بھی قابل فہم ہے۔ سبیلوں پر زنجیروں سے بندھے ہوئے دھاتی گلاس بھی قبول ہیں، ہسپتالوں کی ویسٹ Waste کی نیلامی بھی ہضم کر لی، ...لیکن مرداروں کی انتڑیوں سے تیار کیا گیا کوکنگ آئل؟ میں نے ایک نجی ٹی وی پر اس کوکنگ آئل کی فیکٹری دیکھ کر جو محسوس کیا، اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں...اب اس ملک کے فکری، سیاسی، مذہبی رہنما کدھر ٹامک ٹوئیاں اور جھکیں مارتے پھر رہے ہیں کہ اصل میں تو المیہ ہی کوئی اور ہے۔ کوئی فحاشی کو رو رہا ہے۔ کیسی کوساورنٹی کا مروڑ اُٹھ رہا ہے۔ کوئی امریکہ سے پنجہ آزمائی کا شوقین ہے۔ کسی کو مصر کی فکر کھا رہی ہے، کوئی شام پہنچا ہوا ہے۔

کوئی کہتا ہے میرے سنگ...انڈیا سے جنگ کوئی مغرب کی ''بے راہ روی اور بے حیائی'' کو ایکسپوز کرنے پر تلا ہوا ہے، حالانکہ انہیں ان الفظوں کی Defination ہی معلوم نہیں۔ آؤ مردہ مرغی یا پانی ملے حلال ''گوشت میں تیزاب ملا لہسن، کیمیکل زدہ ادرک، ملاوٹ والی مرچیں، گندے پانی سے سیراب کی گئی سبزی ڈال کر اسے مردار جانوروں کی انتڑیوں سے تیار کئے گئے کوکنگ آئل میں پکائیں اور اخلاقیات کا ختم دلا کر ثواب دارین حاصل کریں کہ مردہ اخلاقیات والی...ہم زندہ قوم ہیں!

طاقت اور دولت:

سمندری طوفان میں ڈوبتے ہوئے آدمی پر بارش کی بوچھاڑ قطعاً کوئی اثر نہیں کرتی اور شاید ہماری بھی یہی کیفیت ہو چکی ہے۔ ہمارا بھی یہی حال ہو گیا ہے کہ اب سانحات کے ویسے اثرات مرتب نہیں ہوتے جیسے ہونے چاہئیں۔ پنڈی ملتان سانحات پر حیرت انگیز قسم کی سرد مہری کا سا عالم تھا جیسے معمول کی کوئی بات ڈسکس ہو رہی ہے۔ اگر کوئی ''جذباتی'' ہوا بھی تو اسے سمجھا گیا... ''پلیز! ریلیکس، ٹیک اٹ ایزی، یہ یا ان سے ملتے جلتے واقعات تو اب روٹین بزنس ہیں، آدمی کتنا اور کب تک رو پیٹ سکتا ہے۔'' جب تک انسان ہیں وہ طاقت اور دولت کے حصول کی جنگ میں مبتلا رہیں گے کہ یہ جنگ تو مہذب ترین دنیا میں بھی جاری ہے لیکن مہذب لوگوں نے ان کے حصول کے چند اصول وضع کر لئے ہیں اور وہ ان اُصولوں کا احترام بھی بہت کرتے ہیں جبکہ ہم صدیوں سے ''فری سٹائل'' کھیل رہے ہیں۔ اہل مغرب ہم سے بڑھ کر پیسے کے پتر ہیں۔ ڈالر اُن کا خدا ہے لیکن وہ حصول دولت کے لئے جعلی دوائیں نہیں بناتے، خوراک میں ملاوٹ نہیں کرتے، اپنی ریلوے کی زمینوں پر قبضے نہیں کرتے، ووٹ بینک بنانے بڑھانے کے لئے سٹیل مل اور پی آئی اے سے لے کر کارپوریشن تک میں غیر ضروری بھرتیاں نہیں کرتے، ریسلی پوسٹنگز نیلام نہیں کرتے، پورا پورا خاندان لے کر ایوان اقتدار پر قبضے نہیں کرتے، ان کے آرمی چیف مارشل لاء نہیں لگاتے، ان کے سیاستدان ان کے ''جی ایچ کیوز'' کے گملوں میں نہیں اُگتے۔ جہاں انسان ہوگا وہاں جرم بھی ہوگا اور گناہ بھی... دولت کا جنون بھی ہوگا اور طاقت کی ہوس بھی لیکن اپنی مخصوص حدود و کینڈے میں لیکن مائیکرو لیول سے لے کر میکرو لیول تک... ہماری تو دنیا ہی نرالی ہے کہ طاقت اور دولت کے حصول کی اس گیم میں اصول ہی کوئی نہیں کہ ادھر طالبان منشتر اُدھر اُن کے حریف منتشر اقبال نے بھی کیا تھری ڈی خواب دیکھا تھا... ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے۔ نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

ہم ایک گلی میں بھی ایک نہیں اور خواب دیکھتے ہیں ''اُمہ'' کے۔

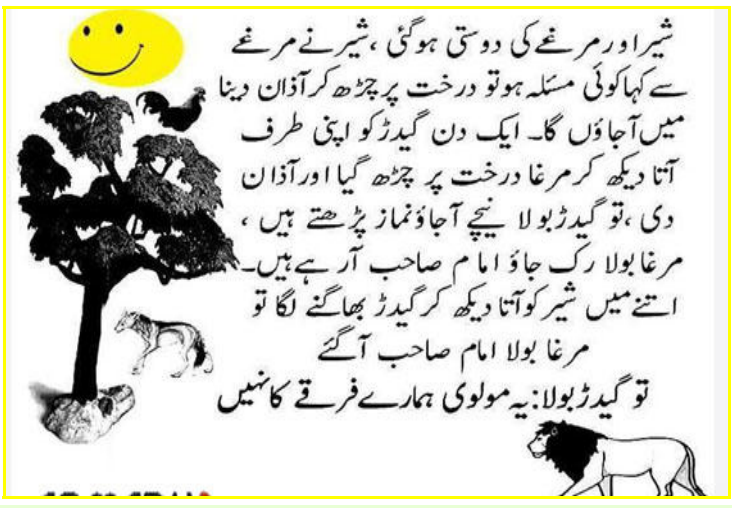

بری امام صوفی بزرگ

عامر سہیل

امام بری سرکار 1617ء (1026ھ) میں موضع جولیاں کر سال ضلع چکوال میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام سید عبداللطیف تھا آپ کے والد محترم کا نام سید محمود شاہ اور والدہ کا نام غلام فاطمہ تھا۔ آپ کے آباؤ اجداد عراق کے علاقہ کاظمین سے ہجرت کر کے گوجر خان کے ایک قصبہ ''سید'' میں آ کر آباد ہو گئے۔

دس بارہ سال کی عمر میں آپ کے بزرگ نقل مکانی کر کے موضع نور پور شاہاں آ گئے۔ یہ گاؤں اسلام آباد سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ گاؤں جسے گکھڑوں نے آباد کیا تھا کسی زمانے میں چور پور کہلاتا تھا۔ بعد میں جب امام بری سرکار نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی تو نور پور شاہاں کہلانے لگا۔ یہاں آپ عرصے تک گلہ بانی کرتے رہتے۔ جانوروں کو چرنے کیلئے چھوڑ کر خود یاد الٰہی میں مصروف ہو جاتے۔ آپ نے کئی سال فقہ، حدیث، منطق، ریاضی، طب اور دیگر علوم حاصل کئے۔ پھر وہاں سے کشمیر، بدخشاں، بخارا، مشہد، دمشق گئے اور بغداد، کربلا، مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ کے سفر کئے۔ اور مناظرے کئے۔ علوم وہاں بڑے بڑے علماء سے ظاہری کی تکمیل کے بعد فریضہ حج ادا کرنے مکہ مکرمہ گئے۔ واپسی پر نور پور شاہاں میں تبلیغ دین کا سلسلہ شروع کیا اور ہزاروں ہندوؤں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ روایت ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر بھی ایک مرتبہ آپ سے ملاقات کیلئے نور پور آیا تھا۔ آپ کی شادی سید نور محمد کی صاحبزادی دامن خاتون سے ہوئی۔ اللہ نے آپ کو ایک بیٹی عطا فرمائی جو کچھ عرصہ بعد فوت ہوگئی۔ بچی کی وفات کے چند دن بعد آپ کی اہلیہ بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ آپ تنہا رہ گئے۔ چنانچہ آپ کا ہر لمحہ یاد الٰہی میں گزرنے لگا۔ دنیا سے ترک تعلق کر کے مجذوب ہو گئے۔ آپ نے حضرت شیخ جمال الدین حیات المیر کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ نے نور پور میں قیام کیا اور تبلیغ دین کا کام شروع کیا۔ اس وقت یہاں دو قبیلے آباد تھے۔

امام بری سرکار کا انتقال 1705ء (1117ھ) میں ہوا۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر خود آپ کے جنازہ میں شریک ہوا اور آپ کا مزار تعمیر کرایا۔

(شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا)

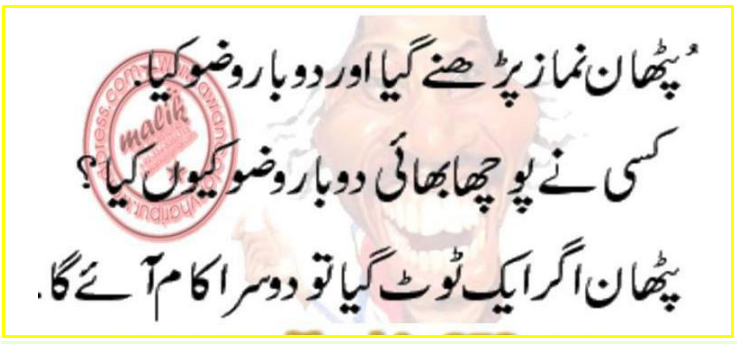

ڈوارفزم کیا ہے؟

بلال افتخار

طبی یا موروثی اسباب کے باعث جسم کی نشوونما رک جانے کو ڈوارفزم کہا جاتا ہے۔لٹل پیپل آف امریکہ کی جانب سے جاری کی گئی تعریف کے مطابق چار فٹ دس انچ تک قد رکھنے والے افراد ڈوارف تصور ہوتے ہیں، تاہم بعض ملکوں میں پانچ فٹ تک اقسام ہوتی ہیں۔ Dwarfism Disproportionate یا غیر متناسب کوتاہ قامتی میں قد چھوٹا رہ جانے کے ساتھ ساتھ جسم کے کسی حصے کی نشوونما نسبتاً زیادہ یا کم ہوتی ہے، سر بڑا یا بازو بہت چھوٹے ہونا وغیرہ جیسی علامات ظاہر ہوتی ہیں جب کہ Dwarfism proportionate یا متناسب کوتاہ قامتی میں قد چھوٹا ہوتا ہی ہے لیکن جسم کے تمام اعضاء بھی قد کے متناسب ہی ہوتے ہیں۔

یہ مسئلہ کیوں ہوتا ہے؟ ماہرین کے مطابق اسکے 200 سے زائد اسباب ہو سکتے ہیں۔ بنیادی طور پر گروتھ ہارمونز میں پیدا ہونیوالی خرابی کے باعث جسم کی نشوونما ایک خاص حد تک ہی ممکن رہتی ہے۔ڈوارفزم کی سب سے عام قسم سکیٹیل ڈائسپلیسز Skeletal Dysplasias ہے۔جس کے اسباب موروثی ہوتے ہیں۔بعض ممالک میں ڈوارفزم کے علاج کیلئے پیوندکاری کا طریقہ بھی استعمال ہوتا ہے جس میں بازو یا ٹانگ کی ہڈیوں کو تبدیل کرنے کیلئے سرجری کی جاتی ہے لیکن یہ انتہائی متنازعہ طریقہ کار ہے۔اس کے علاوہ ہارمون تھیراپی بھی ہوتی ہے لیکن ان صورتوں میں بھی عام طور پر ڈوارفزم کا مکمل علاج نہیں ہوتا بلکہ اس میں مبتلا افراد کو درپیش آنے والی جسمانی پیچیدگیوں کا علاج ہی ہو پاتا ہے۔ (دنیا میگزین 22 نومبر 2015ء)

حسن نیت

سلطان محمود غزنوی جب مدینہ منورہ گیا تو اس نے فقیرانہ لباس زیب تن کیا، کندھے پر پانی کی مشک رکھ کر مخلوقِ خدا کو پانی پلاتا رہا۔ایک شخص نے پہچان کر پوچھا کہ آپ تو بادشاہِ ہند ہیں پھر فقیرانہ لباس کیوں پہن رکھا ہے۔سلطان نے جواب دیا کہ بادشاہ تو میں ہندوستان میں ہوں یہاں رسول عربی ﷺ کے دربار گوہر بار میں تو شہنشاہ بھی فقیر ہوتے ہیں۔یہ ایمان افروز بات سُن کر وہ شخص آگے بڑھا تو دیکھا کہ مصر کا بادشاہ بڑے شاہانہ انداز میں شاہی لباس پہن کر کروفر کے ساتھ ساتھ آرہا ہے۔اسی شخص نے کہا کہ تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تو رسول عربی ﷺ کے در پر اس شاہی لباس کے ساتھ حاضری دے۔مصری بادشاہ نے غیرتِ ایمانی سے لبریز جواب دیا۔کہ اے سائل یہ تاج اور مصر کی بادشاہی مجھے تو رسول عربی ﷺ کے طفیل ہی عطا ہوئی ہے۔دربار رسول ﷺ میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آقا اپنے غلام کی شان اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔وہ شخص دونوں بادشاہوں کی حسنِ نیر کی داد دیتا ہوا چلا گیا۔ (عطرت ناز)

جے پی ایس کڑا...یا...زیور

رجل خوشاب

ہمارے ملک کی اسمبلی میں عورتوں کے تحفظ کے بارے میں ایک بل پیش ہوا۔ جس میں یہ کہا گیا کہ اگر مرد عورت سے زیادتی کرے، تو اُس کے ہاتھ یا پاؤں میں جے پی ایس کڑا ڈال کر علیحدہ کر دیا جائے تا کہ عورت اُس کے شر سے محفوظ رہے۔تو میڈیا پر ایک طوفان برپا ہو گیا، علماء حضرات ٹی وی پر آ کر چلاتے نظر آئے۔عورت کو تحفظ دینے سے ہمارا خاندانی نظام خراب ہو جائے گا۔شریعت کی خلاف ورزی ہوگی۔لبرل طبقہ بھی حسب سابق منافقانہ طرز عمل میں دیکھا گیا۔میں حیران ہوا کہ لبرل عورتیں بھی یہ کہہ رہی تھیں کہ نہیں کی کڑا انگانا ضروری نہیں حالانکہ گزرے زمانے میں مردوں نے ہی عورتوں کے ہاتھوں پاؤں اور گلے میں کرے پہنائے تھے، ناک میں تھیں ڈالی تھیں تا کہ مردوں کی غلامی سے بھاگ نہ سکیں۔دنیا بھر کی عورتیں آج فیشن کے نام پر زیور کی دلدادہ ہیں۔زیوران کی سب سے بڑی کمزوری بن چکا ہے دراصل عورتوں کی غلامی کی ہی نشانیاں ہیں۔جب تک عورت ذات اس زیور کو اُتار کو پھینک نہیں دیتی۔تب تک یہ مردوں کے ظلموں کا شکار بنتی رہیں گی میرے حساب سے تو عورتوں کو تو خوش ہونا چاہیے کہ مردوں کی حکومت میں عورتوں کی حفاظت کی لئے مردوں کو کڑا پہنانے کی بات کی گئی ہے۔خود تو عورتیں دس بارہ چوڑیاں کڑے گلے کا ہار ناک میں نتھ ماتھے پر جھومر پہنے اپنی غلامی کو گلے لگائے رکھتی ہیں۔اپنی حفاظت کے لئے سفاک مردوں کے لئے کڑا بھی منظور نہیں۔ہے نا کمال کی بات۔اتنا کچھ ہو جانے کے بعد عورتیں اب بھی آزادی نہیں چاہتی، کیونکہ انکو معلوم ہی نہیں کہ آزاد دنیا کیا ہوتی ہے جس میں مرد رہ رہا ہے اس دنیا میں کوئی جو مرد ذات کو چیلنج کرنے والا ہو؟

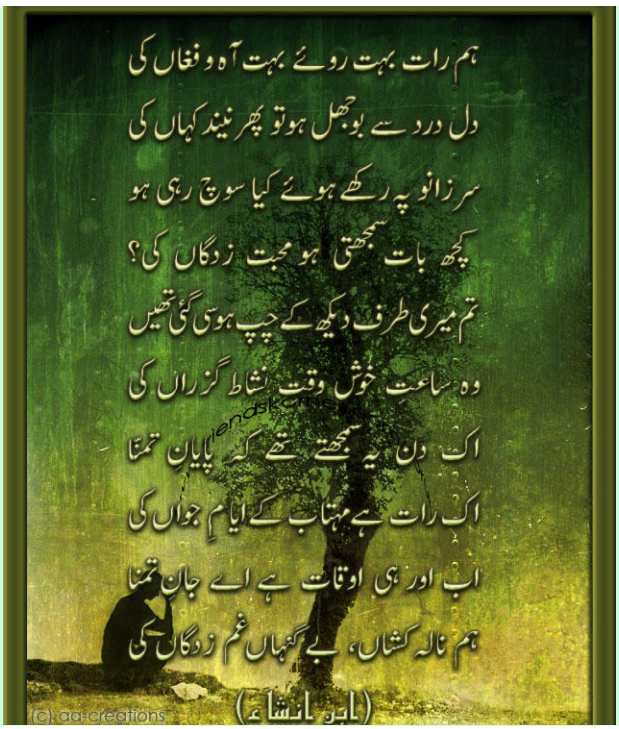

''قریۂ جاوداں'' پر ''ایک طالبہ'' کا تبصرہ

داؤد طاہر

۱۹۹۵ء میں میرا امریکہ اور بعض دیگر مغربی ممالک کا سفرنامہ ''شوق ہمسفر میرا'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس سفرنامے کے ایک باب کا عنوان تھا:

ہے یہ اندھیر مچائے ہوئے تاثیرِ زُحل

راقم نے اس باب میں اُس حادثے کا بھی ذکر کیا تھا جس نے مجھے بہت دن تک پریشان کئے رکھا تھا۔ میرا اشارہ بی اے کے امتحان منعقدہ ۱۹۶۵ء کے نتائج کی بنیاد پر پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے دو طلائی تمغوں کی غلط تقسیم کی طرف تھا۔ الور گولڈ میڈل اور امرت لال رائے گولڈ میڈل جو فی الحقیقت مجھے ملنے چاہئیں تھے یونیورسٹی کی غلطی سے جامعہ نصرت کی ایک طالبہ کو مل گئے۔ میں نے ان میڈلوں کی واپسی کے لیے ممکنہ قانونی ذرائع اختیار کئے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اپنی اس کوشش میں کامیابی نصیب ہوئی۔

راقم نے اپنی حالیہ تصنیف ''قریۂ جاوداں'' میں اپنے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے اس واقعہ کا قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ میری کتاب ''شوق ہمسفر میرا'' اس طالبہ کی نظر سے گذر چکی تھی اور اب انہیں یہ کتاب بھی دیکھنے کا موقع ملا چنانچہ انہوں نے مجھے ٹیلیفون پر یقین دلایا کہ وہ اس سارے جھمیلے سے بالکل بے خبر رہیں نہ انہیں کسی نے میڈل واپس کرنے کو کہا تھا۔ وہ طالبہ اس معاملے میں خود کو بری الذّمہ قرار دے رہی تھیں اور میرا خیال ہے انہوں نے اس حوالے سے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ بعد میں انہوں نے ایک طویل نظم ان میڈلوں کے بارے میں لکھ کر مجھے بھجوائی جسے اس کی ادبی چاشنی کے پیشِ نظر قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ اس نظم سے ضرور محظوظ ہوں گے:

سفر کا ذوق وہ تیرا، وہ ''شوق ہمسفر میرا''
بڑے غصے سے تم نے تھا کیا جس میں ذکر میرا
اگرچہ نام نہ لکھا مگر جُملہ اشاروں سے
ہر اک قاری سمجھ جائے گا کس جا ہے مکاں میرا
اور اب تفصیل اس کی ''جاوداں قریہ'' سے جانی ہے
اگر انصاف سے دیکھو تو اس میں نام ہے میرا
تمہیں دعویٰ ہے آباء سے مرے دیرینہ رشتے کا
تو اس رشتے کے ناطے سے ہی رکھتے کچھ بھرم میرا
قلم ہے ہاتھ میں تیرے، تمہیں لکھنا بھی آتا ہے
پڑوسی کا بھی حق ہوتا ہے جو جائز ہے حق میرا
طلائی تمغے جیتے تھے بہت سی لڑکیوں نے واں
یہی تھا جامعہ نصرت کا اعزاز اور یہی میرا
نہ جانے کیوں مرے تمغوں کی تم نے رُوسیاہی کی
ذرا یہ تو بتاؤ اس میں کتنا دوش تھا میرا
جو سچ پوچھو تو اب جانا کہ کس مشکل سے تم گذرے
برا کیا تھا جو مل جاتا یہ تمغہ بھی تمہیں میرا
عمر کے آخری حصے میں آپہنچے ہیں ہم دونوں
نہ جائے گا ہمارے ساتھ تمغہ تیرا نہ میرا
سمندر پار رہتی ہوں، تمہیں خود دے نہیں سکتی
وگرنہ نذر کر دیتی میں سب، تیرا تھا یا میرا
وصیت میں مگر یہ لکھ دیا ہے اپنے بچوں کو
کہ وہ یہ بھول مت جائیں، اگر کچھ ہے دھیاں میرا
اگر داؤد طاہر سے کبھی ملنا تمہارا ہو
اسے دے دینا سب تمغے جو سمجھو مدعا میرا
مزاروں پر دعا کرنا تمہاری ایک عادت ہے
قبر پر میری پہنچوگے نہ تم، گھر دُور ہے میرا
وگرنہ تم نے کتبے پر یہ لکھ دینا تھا خامے سے
اسی کو تھا ملا اعزاز جو تھا فی الاصل میرا
مگر یہ بات تم کو کیسے سمجھاؤں بتاؤ تو
کہ میں تھی بے خطا اس میں، بھلا کیا جرم تھا میرا
خدارا تھوک دو غصہ، بس اب یہ بھول بھی جاؤ
کہ تمغہ کون سا تیرا تھا اور تھا کون سا میرا

غزل۔ مبارک عابد

کب سے ہوا میں اُڑ گئے لمحے ملاپ کے
اب کیا کریں گے راگ پرندے الاپ کے
پانی کی بُوند بُوند کو دریا ترس گئے
کیا فائدہ ہوا تجھے بارش کو ماپ کے
کتنے جواہرات لب و رُخ پہ کِھل اُٹھے
کتنے گلاب بچھ گئے رستے میں آپ کے
اک وہ کہ یخ فضاؤں میں سرگرم زندگی
اک ہم کہ سست تر ہوئے ہیں دھوپ تاپ کے
بچوں نے ان چراغوں کو مٹی سمجھ لیا
تحفے جو میرے پاس تھے میرے باپ کے
عابدؔ وہ ہولے ہولے سے چاہتا تھا اک غزال
دھوکے میں پھر سے آگیا میں اس کی چاپ کے

برطانیہ میں مذہب سے متعلق قوانین میں اصلاح

(ڈاکٹر طارق احمد مرزا۔آسٹریلیا)

برطانیہ میں گزشتہ سال 26مارچ 2015ء کو ایک نئے قانون No.23 Succession to the Crown Act 2015 کا اجراء کرکے 300سال سے بھی زائد عرصہ سے لاگو اس پابندی کا خاتمہ کر دیا گیا ہے جس کے تحت برطانوی شاہی خاندان کے افراد کو کیتھولک فرقہ سے تعلق رکھنے والے عیسائی سے شادی کرنے کے نتیجہ میں تاج وتخت کی وراثت سے محروم ہوجانا پڑتا تھا۔واضح رہے کہ یہ پابندی 1701ء سے ''Act of Settlement'' کے تحت برطانوی قانون کا حصہ بنی ہوئی تھی۔سولہویں صدی عیسوی میں پاپائے روم اور کیتھولک کلیسیا سے قطع تعلق کرنے کے بعد برطانیہ میں نہ صرف یہ کہ چرچ آف انگلینڈ کا قیام عمل میں لایا گیا تھا بلکہ ایسے قوانین بھی بنادیے گئے جن کی بنیاد مذہبی امتیاز پر مبنی تھی۔ان قوانین کے تحت:

☆ ریاست کا مذہب رومن کیتھولک عیسائیت نہیں بلکہ چرچ آف انگلینڈ کا تجویز کردہ عیسائی مذہب ہوگا۔

☆ چرچ کا سربراہ پوپ (Pope) نہیں بلکہ تاج بردارِ سلطنتِ برطانیہ ہوگا۔

☆ رومن کیتھولک عیسائیوں کو ''پاپائی'' (Pappist) کا نام دے دیا گیا اور کہا گیا کہ اصل کیتھولک چرچ آف انگلینڈ ہے۔

☆ کیتھولک عیسائیوں کے لئے لازمی قرار دے دیا گیا کہ وہ چرچ آف انگلینڈ کی رسومات میں شامل ہوا کریں ورنہ انہیں بھاری جرمانہ اور بدنی سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔

☆ کیتھولک عیسائیوں پر ''Tithe'' نامی ایک مذہبی ٹیکس عائد کر دیا گیا جس کے تحت وہ حکومت کو اپنی آمد کا ایک عشر بطور لگان ادا کیا کریں۔

☆ کیتھولک افراد کو ووٹ کے حق سے محروم کر دیا گیا۔

☆ کوئی کیتھولک ممبر پارلیمنٹ نہیں بن سکے گا۔

☆ کوئی کیتھولک برطانوی فوج میں شامل نہیں ہوسکتا۔

☆ کوئی کیتھولک جج یا اعلیٰ حکومتی عہدیدار نہیں بن سکے گا۔☆ بادشاہ یا ملکہ کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پروٹیسٹنٹ عیسائی ہو جس کا اعلان ایک حلفیہ بیان کی شکل میں جاری کرنا لازمی ہوگا۔

☆ اگر شاہی خاندان کا کوئی فرد کسی کیتھولک سے شادی کرتا ہے تو وہ تاج وتخت کی وراثت سے محروم رہے گا اور اس شادی سے ہونے والی اولاد بھی۔اس سے کہیں قبل 1560ء میں سکاٹ لینڈ میں کیتھولک عیسائیت کو غیر قانونی اور غیر آئینی قرار دے دیا گیا تھا۔

(آزاد دائرۃ المعارف وکی پیڈیا۔بمطابق اشاعت 11مارچ 2016)

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف ادوار میں مذکورہ قانون 1701ء کی اکثر شقوں میں بتدریج اصلاحی ترامیم کر دی گئیں۔چنانچہ ڈیڑھ سو سال کے بعد 1858ء میں غیر پروٹیسٹنٹ (Non-Protestant) افراد کو ممبر پارلیمنٹ بننے کا حق دے دیا گیا اسی طرح 1886ء میں ایسے افراد کو بھی ممبر پارلیمنٹ بننے کی اجازت مل گئی جن کا تعلق کسی مذہب سے نہ ہو۔1974ء میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعہ سلطنتِ برطانیہ کے لارڈ چانسلر (Lord Chancellor) کے انتہائی اہم عہدے کے بارہ میں قانون جاری ہوا جس کے مطابق اب اس عہدہ پر ایک کیتھولک بھی فائز ہوسکتا ہے،تاہم تاجِ برطانیہ کی طرف سے اسے کوئی مذہبی ذمہ داری نہیں سونپی جائے گی۔

برطانوی قانون کی تازہ ترین ترمیم 2015 پر جہاں مختلف حلقوں نے اطمینان کا اظہار کیا ہے وہاں مبینہ طور پر یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ بادشاہ یا ملکہ کے لئے پروٹیسٹنٹ عیسائی ہونے کی شرط کو بھی مزید قانون سازی کے ذریعہ سے ختم کر دیا جائے تاکہ برطانوی آئین ہر قسم کے امتیازی قوانین سے پاک ہوجائے۔

غزل۔ طارق احمد مرزا

بہار آئی ہے، آؤ کہ جشن کا دن ہے
صبا کے ناز اٹھاؤ کہ جشن کا دن ہے

اُتر کے رقص کریں تا نشاط کی پریاں
بساطِ قلب بچھاؤ کہ جشن کا دن ہے

نہ ہو کسی سے بھی نفرت تو پیار سب کے لئے
گلے ہر اک کو لگاؤ کہ جشن کا دن ہے

گراں بہا وہ خزائن جو دفن تھے کب سے
بہ اہتمام لٹاؤ کہ جشن کا دن ہے

ہیں شب گزیدہ پڑے خفتگانِ بے پروا
ضمیر ان کے جگاؤ کہ جشن کا دن ہے

جو زیرِ بارِ معاصی ہیں دنیا بھر کے اُنہیں
سہارا دے کے اُٹھاؤ کہ جشن کا دن ہے

ہو تا کہ عرش سے تم پہ ملائکہ کا نزول
دلوں کو فرش بناؤ کہ جشن کا دن ہے

ہو داغِ سجدہ کی بندیا تو زہد کی افشاں
حنا وفا کی لگاؤ کہ جشن کا دن ہے

خلوص و تقویٰ کے زیور سے اہتمام کے ساتھ
عروسِ دل کو سجاؤ کہ جشن کا دن ہے

لبوں پہ حمد و تشکّر، دلوں میں عزم لئے
زمیں پہ پھیلتے جاؤ کہ جشن کا دن ہے

نظامِ نو سے کرو اک نیا جہاں پیدا
نقوشِ کہنہ مٹاؤ کہ جشن کا دن ہے

ڈاکٹر عبدالسلام تجھ پر سلام

ندیم احمد فرخ

ڈاکٹر عبدالسلام دنیا کی سائنس کی تاریخ کا ایک عظیم کردار ہیں آپ پاکستان کے پہلے نوبل انعام پانے والے سائنسدان ہیں اور عظیم وجود تھے جن میں عاجزی اور وطن سے محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا مگر ڈاکٹر صاحب کی ذات اور آپ کا کام پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی کی نظر کر دیا گیا اور آپ کی نا قدری کی گئی اور آپ کی سیرت پر بہت ساری کتب لکھی گئی ہیں اور جاتی بھی رہیں گی انہی کتب میں سے ایک کتاب ''پاکستان کے نامور سائنسدان'' مصنفہ خالد محمود عاصم ہے اس کتاب میں مصنف نے بہت مفصل طور پر آپ کا ذکر کیا ہے۔ خاکسار اس کتاب میں سے چند ایک اقتباس قارئین کی نظر کرتا ہے۔ مصنف نے صفحہ نمبر 160 پر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا ایک اقتباس نوٹ کیا کہ جس میں آپ فرماتے ہیں کہ علم طبیعیات کی تخلیق تمام بنی نوع انسان کی مشترکہ وراثت ہے۔ مشرق اور مغرب اور شمال اور جنوب نے مساوی طور پر اس میں تعاون دیا ہے مذہب اسلام کی الہامی کتاب قرآن پاک میں اللہ تعالی فرماتا ہے۔

''تجھے رحمان مطلق کی تخلیق میں کوئی خامی نظر نہیں آتی ہے، اس کو بنظر غائر دیکھ۔ کیا کوئی شگاف نظر آتا ہے۔ بار بار کر تیری نظر ڈال کر خیرہ اور پریشان واپس آتی ہے۔

دراصل تمام ماہرین طبعیات کا یہ خیال ہے کہ جتنا گہرائی تک ہم سوچیں اتنی ہی ہماری حیرانی فزوں ہوگی۔

ڈاکٹر عبدالسلام پاکستانی تشخص کو اُجاگر کرنے کے لئے ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔ نوبل انعام حاصل کرنے والوں پر ایک خاص قسم کا لباس پہن کر اس تقریب میں شرکت کی پابندی ہوتی ہے۔ مگر ڈاکٹر عبدالسلام نے نوبل انعام وصول کرنے کی اس تقریب میں اپنا قومی لباس پہن کر جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے شاہِ سویڈن نے بطورِ خاص اس کی اجازت دی اور پھر سیاہ شیروانی، سفید شلوار قمیص، سر پر روایتی پاکستانی پگڑی اور کلاہ اور پاؤں میں میں سنہری طلائی سے کڑھائی کیا ہوا کھسہ پہنے ایک خالص پاکستانی کو سویڈن کے بادشاہ سے دنیائے سائنس کا سب سے بڑا انعام ''نوبل پرائز'' وصول کرتے کروڑوں افراد نے ٹیلی ویژن پر دیکھا۔

علاوہ ازیں انہوں نے نوبل انعام کی اس عظیم الشان ضیافت میں اپنی قومی زبان اُردو میں تقریر کی۔ ڈاکٹر عبدالسلام کو اپنی مادرِ علمی اور اپنے اساتذہ سے بے حد محبت تھی۔ انہوں نے نوبل پرائز سے جو خطیر رقم ملی اس کا زیادہ حصہ انہوں نے ان اداروں کو عطیہ کے طور پر دے دیا جہاں سے انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ گورنمنٹ ہائی سکول جھنگ کو جو رقم انہوں نے دی اس سے سکول کی نئی عمارت تعمیر کی گئی۔ اس کے علاوہ سکول کی سائنس لیبارٹریوں کا خرچ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دینے کا اعلان ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے خود کیا۔ گورنمنٹ کالج جھنگ جہاں انہوں نے جوانی کے دِن گزارے اور سائنس کی حقیقتوں سے آشناء ہوئے، اس کی لیبارٹریوں کے لئے انہوں نے 32 لاکھ روپے کی رقم دی جس سے نئی لیبارٹریاں تعمیر کی گئیں اور ان میں نیا سامان ڈالا گیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے لئے بھی انہوں نے بہت بڑی رقم بطور عطیہ دی۔ ڈاکٹر عبدالسلام اپنے اساتذہ کا از حد احترام کرتے تھے۔ نوبل انعام حاصل کرنے کے بعد جب وہ دسمبر 1979ء میں پاکستان آئے تو حکومت کی طرف سے اسلام آباد میں۔ ایک تقریب منعقد کی گئی جس کی صدارت جنرل ضیاء الحق نے کی ڈاکٹر عبدالسلام کی خواہش پر ان کے پرائمری سکول کے استاد شیر افضل جعفری کو بطورِ خاص مدعو کیا گیا۔ اس طرح کلکتہ یونیورسٹی کی طرف سے دیا جانے والا تمغہ اس شرط پر قبول کرنے کا وعدہ کیا کہ ان کے کلکتہ میں مقیم علم الحساب کے استاد گنگولی صاحب کی عزت افزائی کی گئے۔ چنانچہ ان کی خواہش پر کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر آر کے۔ پڈار صاحب ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ ان کے گھر گئے اور انہیں تین ہزار روپے کا چیک اور سند پیش کی جو ان کی درس وتدریس کی خدمات کے اعزاز میں تھی۔

معروف ادیب اور دانش ور انور سدید ڈاکٹر نے ڈاکٹر عبدالسلام کی موت پر لکھا کہ ''ڈاکٹر عبدالسلام کا تعلق قادیانی فرقے سے تھا جس سے پاکستان کی عامۃ الناس کو اختلاف ہے۔ وہ اپنے عقیدے پر سانحہ ارتحال تک قائم رہے۔ ہمارے عقیدے کے مطابق وہ اللہ تعالیٰ کے ایک بہت بڑے انعام سے محروم رہے۔ خدا نے ان پر سائنس کی بشارتیں اُتاریں۔ ان بشارتوں کی صداقت تجربات سے ہوئی اور ان کی سائنسی صداقتوں کو عالمی سطح پر تسلیم کیا گیا۔ ان کی وفات سے دنیائے سائنس میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ شاید کبھی نہ پر ہو سکے گا۔''

اسی طرح جمیل الدین عالی نے لکھا۔ ''اگر ان کا تعلق ایک اقلیتی فرقے سے نہ ہوتا تو آج پاکستان اور دُنیائے اسلام میں ان کی پرستش ہو رہی ہوتی''

(''پاکستان کے نامور سائنسدان'' مصنفہ خالد محمود عاصم صفحہ 178.179)

محترم سلیم الدین قریشی مرحوم

(محمد ایوب اولیاء)

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی!

سلیم الدین قریشی بھی ہمیں آٹھ مارچ کو داغ مفارقت دے گئے۔مرحوم انڈیا آفس لائبریری (اب برٹش لائبریری) میں مدتوں جنوبی ایشیا کے شعبے کے سربراہ اور رائل ایشیا ٹک سوسائٹی کے فیلو رہ چکے ہیں۔ان کی تصنیفات میں خواب نامہ ٹیپو سلطان، بیاضِ ظفر، غداروں کے خطوط، قائداعظم کی سوانح عمری، غدر کے حالات پر انگریزی زبان میں کتاب (سابق جج، سفیر، اور پروفیسر سیموئیل مارٹن برک جو ۱۰۴ سال کی عمر پاکر فوت ہوئے) نے اُن کے ساتھ ملکر The last Mughal اور The British raj in India of Indiemperor جیسی بیش قیمت کتب لکھیں۔وہ ان دنوں Lord Clive پر تحقیق کر رہے تھے۔محترم سلیم الدین قریشی مرحوم بڑے نفیس، مخلص، مرنجامرنج، اور نیک دل انسان تھے۔عالم و فاضل، محنتی تھے۔نیز علمی کاموں میں ہر شخص کی مدد کر کے خوش ہوتے تھے۔ہر کسی کی علمی تحقیق و تجسس میں دستگیری کیا کرتے تھے۔پاک و ہند سے آنے والے ہر ایک تاریخ کے طالب علم کو کتب کی فراہمی میں مدد کرنا اُن کا خاصہ تھا۔بتایا کرتے تھے کہ جب خان عبدالولی خان انڈیا آفس لائبریری میں تحقیق کے لئے آئے تو خاکسار نے کتب تک رسائی اور تلاش میں ان سے کافی تعاون کیا تھا۔اسی طرح کافی محققین ان کے تعاون پر رطب اللسان ہیں۔اتنے بڑے عہدے پر ہونے کے باوجود، انکساری، عاجزی اُن کا شیوہ تھی۔بیماری کے طویل عرصہ میں بھی آکسیجن کا ماسک لگا کر مسلسل آٹھ دس گھنٹے کام کرنا اُن کا معمول رہا۔ہم سب شاملین اجلاس SOS محترم سلیم الدین قریشی مرحوم کے اہلِ خانہ مالک، ماریا بھابھی بیٹے یوسف اور بیٹی رُخسانہ کے اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔اللہ تعالیٰ ان سب وارثان کو صبر جمیل سے نوازے اور محترم سلیم الدین قریشی مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے آمین

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

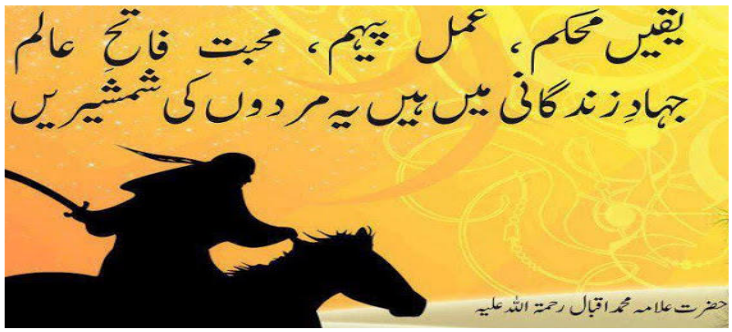

افسانہ

چاردیواری

امجد مرزا امجد

’’واہ چاچی! تمہیں نہیں علم...ارے یہ ملک جی نے تو الفورڈ میں ایک عورت رکھی ہوئی ہے سنا ہے وہ بھی اپنے خاوند سے بھاگ کر آئی ہے۔ایک بچی بھی ہے، اب اللہ جانے وہ ملک صاحب کی ہے یا اس کے پہلے خاوند کی۔یہ بھی سنا ہے کہ ملک اسے پورا خرچہ دیتا ہے۔کیوں نہ دے وصول بھی تو کرتا ہے...!!‘‘ یہ کہہ کر رشیدہ نے چاچی کے کندھے پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگایا۔’’توبہ توبہ کیا زمانہ آگیا ہے گھر میں جوان بیٹا ہے اس کا ہی شرم کرتا۔بھلا وہ کیا سوچتا ہوگا کہ اس کی ماں کا کفن ابھی میلا نہیں ہوا کہ باپ نے رکھیل رکھ لی۔‘‘ چاچی کانوں کو ہاتھ لگا کر کہہ رہی تھی کہ رشیدہ نے بات کاٹی۔’’مگر چاچی اس کا بیٹا کون سا فرشتہ ہے۔وہ بھی تو انتظار کر رہا ہوتا جوں ہی باپ گاڑی میں بیٹھ کر گیا وہ جا کر اپنی گرل فرینڈ کو گھر لے آتا ہے اس نے بھی ایک ٹھگنی سانولی سی لڑکی رکھی ہوئی ہے کوئی ہندو لگتی ہے مجھے تو...سکرٹ پہنا ہوتا ہے۔اِدھر باپ الفورڈ جا کر منہ کالا کرتا ہے ادھر اس کا بیٹا اپنی دوست کو لئے اپنے گھر میں جھک مار رہا ہوتا ہے۔‘‘’’ہاں ہاں جیسا باپ ویسا بیٹا۔کہتے ہیں نا دیوارا اپنے بنیادوں پر ہی جاتی ہے۔کیسا زمانہ آگیا ہے کسی کو کسی کی شرم نہیں...‘‘ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

’’اچھا رشیدہ چلوں اب۔کھانا بھی تیار کرنا ہے میرے بچے بھی کام سے آتے ہوں گے۔شکر ہے اللہ کا کہ اس نے ہمیں اس عذاب سے بچایا ہوا ہے۔میرا بڑا تو گھر سے ٹفن میں کھانا لے کر جاتا ہے۔اور چھوٹی کو اگر ساتھ سینڈوچ نہ باندھ دوں۔مجال ہے جو کینٹین میں جا کر کچھ کھا لے۔باپ نے کئی بار کہا ہے کہ کالج سے کچھ کھا پی لیا کرو مگر توبہ کرو مجال ہے ایک پیسہ خرچے وہاں...یہی حال منجھلی کا ہے ہفتے بعد پورا پیکٹ تنخواہ کا باپ کے ہاتھ پر رکھ دیتی ہے۔اور وہ میرا بلّو وہ تو اب بھی گود میں بیٹھ کر کھاتا ہے اس کا بچپنا نہیں گیا...بات پھر گھر کے ماحول کی آتی ہے نا۔بچوں کو اچھے آداب سکھاؤ انہیں اپنے مشرقی طور طریقے سمجھاؤ تو وہ جانیں۔‘‘ یہ کہہ کر چاچی نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اپنے گھر پہنچ کر چاچی کچن کی کرسی پر جا بیٹھی اور دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر چاروں جانب دیکھا جہاں ہر سو ویرانی اور خاموشی تھی۔وہ سسک پڑی۔’’اے میرے اللہ...ہم پر رحم کرنا...لگتا ہے یہ ہر گھر کی کہانی ہے۔ہر گھر کی چار دیواری شکستہ ہو چکی ہے۔کیسے کوئی اپنا پیٹ ننگا کرے۔اللہ میرے منیر کو عقل دے کہ وہ اس کمینی گوری کے چنگل سے نکل آئے آج دو ماہ ہونے کو آئے باپ نے کیا دو لفظ غصے میں کہہ دیئے پلٹ کر واپس نہیں دیکھا...اور یہ میرا چھوٹا بلّو...اسے تو میں اسی سال پاکستان جا کر اپنی بھانجی سے بیاہ ڈالوں گی اس کے لچھن بھی اچھے نظر نہیں آتے رات رات بھر لفنگے دوستوں کے ہمراہ باہر رہتا ہے۔ادھر سلیمہ کی بھی فکر رہتی ہے آج اس کا باپ گھر آئے تو اسے کہوں گی اسے کسی بہانے لے جا واپس اور بیاہ ڈال کسی نتھو خیرے سے ورنہ یہ کلموئی بھی کوئی گل کھلائے گی اور اب چھوٹی بھی اس کی دیکھا دیکھی سرخی پاؤڈر تھوپ کر کالج جانے لگی ہے۔روز کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر دیر سے آتی ہے...‘‘ چاچی نے لمبی سی سانس لی اور اپنی آنکھوں کو دوپٹے سے خشک کیا مگر دو قطرے اس کی گالوں سے بہتے ہوئے اس کے ہاتھوں پہ جا چمکنے لگے۔

کمرے میں اس کی ہلکی ہلکی سسکیوں کی آوازیں لہرانے لگیں۔

اسلام پاکستان اور نظام مصطفیٰ

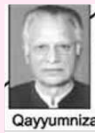

منظر نامہ
قیوم نظامی
Qayyumnizami@gmail.com

پاکستان کی مذہبی جماعتوں نے 2016ء میں نظام مصطفی کے نام پر 1977ء جیسی تحریک چلانے کا اعلان کیا ہے۔ اس اعلان سے ثابت ہوا کہ مذہبی جماعتیں رجعت پسند اور قدامت پسند ہیں۔ حکیم الاُمت اور مفکر اسلام علامہ اقبال نے درُست تشخیص کی تھی۔

دین کا فرفکر وتدبیر جہاد -- دین ملائی سبیل اللہ فساد

پاکستان اپنی بقا اور سلامتی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ مذہبی جماعتیں اس جنگ میں معاون بننے کی بجائے رکاوٹ بننے کی کوشش کر رہی ہیں۔ کاش مذہبی جماعتیں متحد ہو کر ایک شہر آباد کرتیں اور اسے ریاست مدینہ کی طرح اسلامی ماڈل کے طور پر پیش کرتیں جس کی خوشبو نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا میں پھیل جاتی۔ مذہبی جماعتوں کی عملی سرگرمیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نظر اسلام پر نہیں بلکہ ''اسلام آباد'' پر ہے۔ تحریک پاکستان بنیادی طور پر سیاسی جمہوری اور معاشی تحریک تھی جو مسلمانوں کے بنیادی انسانی حقوق کے حصول کیلئے شروع کی گئی تھی۔ اس تحریک کو نتیجہ خیز بنانے کیلئے اسلام کا نام استعمال کیا گیا اگر یہ تحریک خالصتاً اسلامی ہوتی تو علمائے دیوبند، جماعت اسلامی اور کانگریس میں شامل مسلمان رہنما کبھی اس کی مخالفت نہ کرتے۔ 1946ء کے انتخابات جو پاکستان کے نام پر لڑے گئے تھے ان کے دوران مولانا شبیر احمد عثمانی اور انکے رُفقاء نے اسلام، کلمہ، قرآن اور رسول ﷺ کے نام پر انتخابی مہم چلائی اور مسلم لیگ کے اُمیدواروں کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اشتیاق احمد: Tragedy through secret Brtish reports Oxford Press.۔ قائداعظم چونکہ اقلیتوں کو مساوی حقوق دینا چاہتے تھے اور ایسی ریاست کیخلاف تھے جس میں غیر مسلم ذمی قرار پائیں اور ان سے دوسرے درجے کا سلوک کیا جائے اسی لیے وہ مذہب کو ریاست اور سیاست سے الگ رکھنا چاہتے تھے جس کا اظہار انہوں نے کھل کر 11 اگست 1947ء کو دستور ساز اسمبلی سے پہلے خطاب میں کیا۔ لیاقت علی خان، راجہ صاحب آف محمود آباد، چوہدری غلام محمد، چوہدری محمد علی اور کئی دوسرے مسلم لیگی رہنما پاکستان کو اسلامی ریاست بنانا چاہتے تھے مگر ان میں قائداعظم کے سامنے اختلاف کی جرائت نہیں تھی۔ قیام پاکستان کے بعد مذہبی جماعتوں نے اسلامی ریاست کی تشکیل کیلئے دباؤ بڑھا دیا جس کے نتیجے میں لیاقت علی خان نے دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد پیش کر دی۔ حسین شہید سہروردی اور اقلیتی اراکین اسمبلی نے قرارداد مقاصد کی مخالفت کی البتہ دستور ساز اسمبلی کے اکثریتی اراکین نے اسکی منظوری دیدی جو اب 1973ء کے آئین کا مؤثر حصہ ہے۔ قائداعظم اور اُنکے رُفقاء اسلام کے سنہری اُصولوں مساوات، انصاف، امانت، دیانت، برداشت، مشاورت اور اُخوت کے مطابق نئی ریاست کی تشکیل چاہتے تھے جبکہ مذہبی جماعتوں کو اسلام کے سنہری اُصولوں سے کوئی غرض نہیں ہے اور وہ ایسی ریاست کا خواب دیکھ رہے ہیں جو جدید نہیں بلکہ قدیم ہو اور اس پر مذہبی رہنماؤں کی بالادستی ہو۔ اس خواب کی تعبیر کیلئے ''نظام مصطفیٰ'' کا سہارا لیا جاتا ہے۔ مذہبی جماعتوں کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ پاکستان کے عوام ہیں جو دہشت گردی کے خوف کے باوجود ایسی سیاسی جماعتوں کو ووٹ دیتے ہیں جو قائداعظم اور علامہ اقبال کے تصورات اور نظریات کی علمبردار ہیں۔ مذہبی جماعتوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ مسلک کے نام پر منقسم ہیں اور یہ تقسیم اس قدر گہری ہے جسے ختم کرنے کیلئے کسی مجدّد کی ضرورت ہے۔

مذہبی جماعتیں اسلامی ریاست اور نظام مصطفیٰ کا مطالبہ تو کرتی ہیں مگر تا حال متفقہ اسلامی ریاستی نظام قوم کے سامنے پیش نہیں کر سکیں جس کیمطابق ریاست کو چلایا جا سکے۔ جسٹس محمد منیر اور جسٹس رُستم کیانی پر مشتمل کمیشن نے 1953ء میں احمدیوں کیخلاف فسادات کے بعد تحقیق کے دوران سینکڑوں مذہبی رہنماؤں کے بیانات ریکارڈ کیئے اور اپنی رپورٹ میں تحریر کیا کہ علماء اسلام، مسلمان اور اسلامی ریاست کی تعبیر اور تشریح پر متفق نہیں ہیں اور ایک مسلک کے علماء دوسرے مسلک کے لوگوں کو دائرہ اسلام سے خارج تصور کرتے ہیں۔ مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، مولانا احمد علی، میاں طفیل محمد اور مولانا عبدالحامد بدایونی نے منیر کمیشن کے سامنے اعتراف کیا کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق مسلمانوں کے حقوق کے برابر نہیں ہو سکتے۔ منیر انکوائری رپورٹ گورنمنٹ پرنٹنگ پریس لاہور 1953۔ 1970ء کے انتخابات ''نظریاتی بنیادوں'' پر لڑے گئے۔ لاہور میں جماعت کے امیر میاں طفیل محمد نے اسلامی نظام اور پی پی پی کے رہنما بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید نے اسلامی سوشلزم کے نام پر انتخاب لڑا جس میں شیخ محمد رشید ایک لاکھ سے زیادہ ووٹوں کی برتری سے کامیاب ہوئے۔ مذہبی جماعتیں انتخاب ہار گئیں پھر بھی اسکے باوجود 1973ء کے آئین میں انکی رائے کو اہمیت دی گئی۔ 1973ء کے آئین میں اسلام کو ریاست کا مذہب قرار دیا گیا۔

آئین میں یہ آرٹیکل بھی شامل کیا گیا کہ پاکستان میں کوئی قانون، قرآن اور سنت کے منافی نہیں بنایا جائیگا۔ بھٹو صاحب نے پہلی بار مذہبی اُمور کی وزارت قائم کی۔ مکہ و مدینہ کے علماء کو پاکستان کے دورے پر بلایا، غلطیوں سے پاک قرآن کی اشاعت کا قانون بنایا، حاجیوں کو سبسڈی دی، احمدیوں کو اسمبلی سے اقلیت قرار دلوایا، شراب، جوئے خانوں اور نائٹ کلبوں پر پابندی عائد کر دی، جمعہ کو سرکاری تعطیل کا دن قرار دیا، اسلامیات کو لازمی مضمون قرار دیا، رویت ہلال کمیٹی بنائی، اسلامی نظریاتی کونسل تشکیل دی، عربی زبان کو فروغ دیا۔ عالم اسلام کے اتحاد کیلئے اسلامی

سربراہی کانفرنس کا انعقاد کرایا۔ ریڈ کراس کو ہلال احمر کا نام دیا۔ حکومت کے زیر اہتمام پہلی بار سیرت کانفرنس منعقد کرائی۔ مذہبی جماعتوں کو اگر اقتدار کا لالچ نہ ہوتا تو وہ اسلامی آئین اور جمہوریت کو چلنے دیتیں مگر موقع ملتے ہی وہ آمر جرنیل ضیاء الحق کے ساتھ مل گئیں۔ جنرل ضیاء الحق نے خانہ کعبہ میں نوے روز کے اندر انتخابات کا وعدہ کیا۔ اسکے کھلے جھوٹ اور منافقت کے باوجود مذہبی جماعتیں نظام مصطفی کو نظر انداز کرتے ہوئے اقتدار کے مزے لوٹتی رہیں۔ جنرل ضیاء الحق اسلام کے نام پر ریاست پر قابض رہا اس نے آئین میں ترامیم کرکے اس کا توازن ہی ختم کر دیا اور نفرت، فرقہ واریت، عدم برداشت اور سیاسی جہاد کی جو فصل کاشت کی اس کو کاٹتے کاٹتے کم وبیش ایک لاکھ پاکستانیوں کی جانیں قربان ہو چکی ہیں اور ابھی تک منزل واضح نہیں۔ مذہبی جماعتیں امیر المومنین ضیاع الحق کے ساتھ مل کر دس سال میں قابل عمل اسلامی ماڈل پیش نہ کرسکیں اور اپنی پرانی غلطیوں کی قوم سے معافی مانگنے کی بجائے ایک بار پھر ''نظام مصطفی'' کے نام پر تحریک چلانے کی دھمکیاں دینے لگی ہیں۔ غیر سیاسی علمائے حق ہمارے لیے انتہائی قابل احترام ہیں جو حقیقی معنوں میں لاالہ الااللہ کی اذان دے رہے ہیں۔ ایسے مذہبی سیاسی رہنما خال خال ہیں جنہوں نے نظام مصطفی کو اپنے چھ فٹ کے جسموں پر نافذ کر رکھا ہے اگر مذہبی سیاسی رہنما اپنے عملی کردار کو سیرت رسول ﷺ کے مطابق تشکیل دیتے تو پاکستان کے عوام ان کو اپنے ووٹوں سے اقتدار کے ایوانوں میں پہنچا دیتے۔ پاکستان کے سابق سیکریٹری خارجہ کہتے ہیں کہ ہم نے پاکستان، اسلام اور جمہوریت کے نام پر حاصل کیا تھا مگر 69 سال گزرنے کے بعد بھی آج پاکستان میں اسلام ہے نہ جمہوریت ہے۔

یارب یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

مذہبی رہنماؤں نے 1973ء کے آئین پر دستخط کیے تھے ان کی مرضی اور منشاء کے مطابق آئین میں کئی ترامیم بھی کی گئیں۔ اب مذہبی جماعتیں حالات کی سنگینی کا ادراک کرتے ہوئے ''نظام مصطفی'' کی طرز پر تحریک چلانے کی بجائے آئین پر عملدرآمد کی تحریک چلائیں اور سیاسی بلوغت کا ثبوت دیں۔ پاکستان کا آئین جدید اسلامی فلاحی اور جمہوری ریاست کی تشکیل کی ضمانت دیتا ہے۔ اگر اس پر نیک نیتی کے ساتھ عملدرآمد شروع کر دیا جائے تو اسلام کے سنہری اُصولوں کے مطابق معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے مگر سیاسی مذہبی جماعتوں کی منزل چونکہ اسلام کے نام پر اسلام آباد ہے اس لیے وہ چین سے نہیں بیٹھیں گی۔ حکیم الاُمت نے ایک سو سال پہلے جو کہا وہ آج بھی سیاسی مذہبی رہنماؤں پر صادق آتا ہے... میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا... مسائل نظری میں اُلجھ گیا ہے خطیب۔

اُردو کے ''پردیسی'' خادم

(ڈاکٹر طارق احمد مرزا۔ آسٹریلیا)

مشہور عام مصرعہ ''زبانِ یارِ من تُرکی و من تُرکی نمی دانم'' کا خالق تو محض اپنی مجبوری اور لاچارگی کا اظہار کر کے چپ ہو رہا تھا مگر کچھ دھن کے پکے ایسے بھی ہوتے ہیں جو زبانِ یار سیکھ کر یار کی راہ میں حائل زبان کی خلیج بھی پار کر لیتے ہیں۔ یہاں ایک ایسے ہی دھن کے پکے اور باصلاحیت چینی نژاد وجود کا ذکر کرنا مقصود ہے جن کی قومیت اور مادری زبان چینی ہے مگر جب وہ اردو کی مٹھاس سے روشناس ہوئی تو اسے ''چینی'' سے بھی زیادہ شیریں پا کر اس سے ایسے شِیر و شکر ہوئی کہ اردو میں باقاعدہ شاعری کرنے لگ گئے۔ میری مراد پروفیسر چانگ شی شوان ZHANGSUIXUAN سے ہے جن کے نام کا اردو ترجمہ ''انتخاب عالم'' بنتا ہے اور وہ دنیا بھر کے اردو دان طبقہ میں اسی نام اور تخلص سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ چین کی مختلف یونیورسٹیوں کے فاضل پروفیسر، اردو اور چینی زبانوں میں متعدد کتابوں کے مصنف اور رسالہ ''چین باتصویر'' کے مدارالمہام جناب انتخاب عالم صاحب اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں:

غالباً ''چینی'' سے بھی شیریں ہے اُردو دیکھئے... چین کا عالم بھی اب اس میں غزلخواں ہوگیا! اور اس کا باعث کیا تھا۔

شاعری کرتے ہیں ہم عالم زبان یار میں
ہے زبانِ یار یہ اردو زباں، ہم کیا کریں

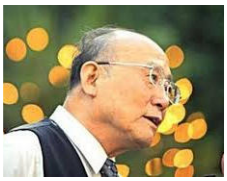

پروفیسر چانگ شی شوان ''انتخاب عالم''

مگر واضح رہے کہ ''شریف''، اور باوضع انتخاب عالم کا محبوب کوئی گوشت پوست کا انسان نہیں بلکہ ان کے زرخیز دماغ کی ایسی تخیلاتی پیداوار ہے جو نہ صرف خود زمان و مکان کی حدود و قیود سے ماورا، اور آزاد ہے بلکہ شاعر کے لئے اس کا ہونا نہ ہونا بھی کوئی معنی نہیں رکھتا کہ اصل مقصد تو صرف اور صرف اردو میں مافی الضمیر کا اظہار ٹھہرا۔ یہ وہ منفرد عالمِ کیفیات و ابلاغیات ہے جہاں زبانِ یار، یار سے بھی کہیں آگے نکلتی ہوئی نظر آتی ہے اور محبوب کی عدم موجودگی میں در و دیوار سے اردو میں باتیں کرتے ایک چینی شاعر کے تخیلات اور تصورات کی دنیا الفاظ کا رُوپ دھارتی اس کی بیاض کا حصہ بن جاتی ہے!۔

مجھ کو کچھ احساس تنہائی نہیں تیرے بغیر
بات کرتا ہوں کبھی در سے کبھی دیوار سے (عالم)

انتخاب عالم کا در و دیوار سے باتیں کرنا کسی خلفشار، وحشت یا مردم بیزاری کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک باشعور اور ذمہ دار شاعر کے جاگتے ضمیر کا غماز ہے۔

پاس ِ وعدہ کر ذرا اے شاعرِ نُور و سحر
پھر قلم کی لرزشوں سے سونے والوں کو جگا (عالؔم)

باشعور اور دیدہ ور شخص تو ہجوم میں بھی خود کو تنہا محسوس کرتا ہے جس کا علم بسا اوقات اس کے ہمسفر ساتھی کو بھی نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ آپ کہتے ہیں ۔

رفاقتوں سے یہ تنہائی کم نہیں ہوتی
شریک بزم تو تھا میں، مگر اکیلا تھا
کیا تھا ہم نے سفر ساتھ ساتھ یوں عالؔم
کہ میں اکیلا مرا ہم سفر اکیلا تھا

لیکن یہ یاد رہے کہ اپنی ذات کا ادراک رکھنے والا دیدہ ور اور باشعور شاعر کبھی حقائق کی حدود پار کر کے نرگسیت کی دنیا میں قدم نہیں رکھتا۔ اس دنیا میں موجود دوسرے انسانوں کی نہ صرف یہ کہ تعظیم و تکریم کرتا ہے بلکہ وہ تو محروموں کا غم بھی بٹاتا اور مظلوموں کو جینے کا حوصلہ بھی دیتا ہے۔

آؤ تھوڑی دیر بیٹھیں رُو برو ہم اور تم
پھر پئیں خونِ جگر کے کچھ سبو ہم اور تم
ذلتوں سے ہی جنم لیتی ہیں عالم عزّتیں
وقت آئے گا تو ہوں گے سُرخرُو ہم اور تم

اردو اور چینی زبان میں متعدد کتابوں کے مصنف اور اردو شاعری کو نت نئی تراکیب عطا کرنے والے انتخاب عالم کا شعری مجموعہ ''گلبانگ وفا'' کے نام سے ادارہ اکادمی ادبیات پاکستان نے شائع کیا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ انتخاب عالم اپنی نوعیت کی کوئی واحد مثال نہیں۔ اس سے قبل کی بھی ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جب دوسری قوموں سے تعلق رکھنے والے افراد نے، جن کا برصغیر پاک و ہند سے کوئی نسلی اور لسانی تعلق نہ تھا، نہ صرف یہ کہ اردو زبان سیکھی بلکہ نظم و نثر میں تخلیقات کے جوہر بھی دکھائے۔ ان میں سے بعض تو استاد داغؔ کے ہم عصر تھے جن سے مل کر ہی غالباً داغؔ نے یہ ارشاد فرمایا ہوگا کہ ۔

اُردو ہے جس کا نام، ہمیں جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دُھوم ہماری زباں کی ہے

تاریخ کی روشنی میں تو بہر حال پورے وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ داغؔ کا یہ شعر کسی خوش فہمی کا اظہار یا شاعرانہ تعلّی و مبالغہ آرائی کا نمونہ ہرگز نہیں۔ معروف محقق رام بابو سکسینہ (Ram Babu Saksena) نے اپنی کتاب European and Indo-European poets of Urdu and Persian میں ایک نوجوان انگریز کپتان الیگزانڈر ہیدرلی (Alexander Heatherly) کا ذکر کیا ہے جو بہادر شاہ ظفرؔ کے دربار میں حاضر ہوتے اور مشاعرہ میں اپنا اردو کلام سنا کر داد پاتے تھے۔ آپ کا تخلص آزادؔ تھا۔ آپ داغؔ اور غالبؔ سے ملاقات رکھتے بلکہ غالب کے چہیتے بھانجے نواب زین العابدین عارفؔ سے تو باقاعدہ اصلاح لیتے تھے۔ افسوس کہ اپنے استاد کی طرح خود بھی بے وقت کی موت دنیا سے رخصت ہوگئی۔ اسی طرح ایک اور انگریز بینجمن ڈیوڈ مونٹ روز (B,D,Montrose) کا نام بھی قابلِ ذکر ہے جو مضطرؔ کا تخلص کرتے تھے اور جناب داغ دہلوی کے شاگرد تھے جن کی معیت میں انہوں نے تقریباً دس سال گزارے۔ انہوں نے بھی چار دیوان اردو شاعری کے چھوڑے ہیں۔ اس کتاب میں ایک اور انگریز شاعر جارج پیش شور (George Paish Shore) کا نام بھی درج ہے جو اردو ادب میں ایک یا دو نہیں بلکہ نصف درجن اردو دواوین اور ایک طویل اردو مثنوی کا (جو اُن کی آپ بیتی پر مشتمل ہے) اضافہ کر گئے۔ ان کے علاوہ اردو شاعری کرنے والے غیر ملکیوں میں ڈینیل گارڈنر Daniel Gardner Socrates (تخلص شُکرؔ) آگسٹین ڈی سلوا Augustine e DSylva (تخلص مفتونؔ)، میجر جلین طالب، میجر سر فلورنس (مطلبؔ) Major Sir Florence اور جنرل جوزف بینسلی General Joseph Bensley بھی شامل ہیں جو اردو کے علاوہ فارسی میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ انگریزوں کے علاوہ ایسے فرانسیسی، جرمن اور پرتگالی افراد بھی تھے جنہوں نے فارسی اور اردو کلام نظم و نثر اپنے پیچھے چھوڑا۔ ان لوگوں میں وہ تاجر، پادری یا فوجی شامل ہیں جو مختلف ادوار میں ہندوستان وارد ہوئے اور یہاں کی تہذیب، ثقافت اور ادبی و شعری روایات کو اپنائے بغیر نہ رہ سکے۔ آگسٹین ڈی سلوا مفتون ایک انڈو پرتگیز (Indo-Portuguese) خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان میں اور کئی اردو شاعر بھی ہوئے جن میں ڈون ایلیس ڈی سلوا Don Ellis De Sylva کا نام نمایاں ہے جن کا تخلص فطرتؔ تھا۔ بھارت کے ایک اخبارِ ''دی ہندو'' The Hindu نے 4 اپریل/ 2005 کی (آن لائن) اشاعت میں بھی مندرجہ بالا شعرا کے علاوہ ان متعدد غیر ملکی خواتین کا بھی ذکر کیا ہے جو ٹکسالی اردو میں شاعری کرتی تھیں۔ ان میں سے اکثر نے پردہ اخفا میں رہ کر قلمی ناموں سے شاعری کی مثلاً فرحت زارا کا اصل نام آئرین جیکب Irene S. Jacob تھا۔ اور اسی طرح ایک امریکی خاتون اور ان کی بیٹی بالترتیب ملکہ جان اور گوہر جان کے نام سے شاعری کیا کرتی۔ جدید دور کی طرف آئیں تو مشہور جرمن نژاد مستشرق پروفیسر این میری شمل Annemarie Schimmel کا نام آتا ہے جو موصوفہ ازم پہ تحقیق کرتے کرتے اردو زبان سے متعارف ہوئیں اور پھر اس میں ایسی ڈوبیں کہ ایک کتاب لکھ کر ساری دنیا کو اردو زبان اور اس کے آغاز سے لے کر جدید دور تک کے تمام اہم شعرا اور ادیبوں کا تعارف ایک کتاب میں لکھ کر ہی دم لیا جو Classical Urdu literature from the beginning to Iqbal کے نام سے شائع ہوئی اور جو آپ کی کتابوں کے سلسلہ A History of Indian Literature کا ایک حصہ ہے۔

(پروفیسر این میری شمل)

آپ سات مختلف زبانوں پہ عبور رکھتی تھیں جن میں اردو کے علاوہ ترکی، فارسی اور عربی بھی شامل ہیں۔ ہاورڈ یونیورسٹی میں امریکیوں کو غالبؔ و میرؔ پڑھاتی رہیں اور اسی طرح آپ نے ہائڈل برگ یونیورسٹی میں شعبہ اردو قائم کیا جس میں اردو زبان پہ تحقیق کرنے والوں کو پوسٹ گریجوایٹ ڈگریاں ملتی ہیں۔

اس ادارہ کی موجودہ جرمن نژاد سربراہ Christina Oesterheld.Dr بھی بے تکان شستہ اُردو بولتی ہیں۔ چند ماہ قبل عالمی مالیاتی ادارہ آئی ایم ایف میں کام کرنے والے ایک امریکی John Hanson جو دنیا کی پندرہ سے زائد زبانوں پہ مہارت رکھتے ہیں اردو زبان میں انٹرویو دیتے ہوئے ایک کاغذ پہ داغؔ کا شعر (اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ.....) اردو رسم الخط میں لکھ کر سامعین وناظرین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔

یورپین اقوام خصوصاً انگریزوں میں فارسی، ہندی اور اردو زبانیں سیکھنے اور سکھانے کا رجحان پیدا کرنے میں اہم کردار انگلستان میں قائم ایسٹ انڈیا کالج نے ادا کیا جس میں برصغیر پاک و ہند میں رائج زبانیں پڑھائی جاتی تھیں۔ یہ کالج کلکتہ میں قائم مشہور عالم فورٹ ولیم کالج، جس کی بنیاد 1800ء میں رکھی گئی تھی، کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے قائم کیا گیا تھا۔

فورٹ ولیم کالج میں درس وتدریس، مصور کی نظر میں

گو یہ دونوں ادارے ابتدائی اور بنیادی طور پر تجارتی، اقتصادی، انتظامی اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے قائم کیئے گئے تھے لیکن ایک لحاظ سے یہ ادارے اردو کی ترویج وترقی میں اہم کردار ادا کر گئے۔ جدید اردو چھاپہ خانوں نے بھی اردو اور فارسی میں لکھی کتابوں اور مسودات کو کثیر تعداد میں شائع کر کے نہ صرف یہ کہ انہیں ہر خاص وعام کی دسترس میں پہنچا دیا بلکہ انہیں دنیا کے مختلف حصوں میں رہتی دنیا تک محفوظ بھی کر دیا۔ آج کی ''انٹرنیشنل'' اردو غالباً انہی کی رہین منت ہے۔

❁

خواجہ محمد عارف صاحب کے متعلق تاثرات

خواجہ خورشید احمد۔ چیئرمین ادبی وثقافتی ادارہ ''تعمیر'' میرپور

خواجہ محمد عارف پردیس (برطانیہ) میں بھی اپنے دیس (میرپور کشمیر) کی ہواؤں، فضاؤں، دینی اقدار، مشرقی روایات، اپنوں کی محبتوں، اُن کی حسین یادوں سے اپنے من اور فن کی دنیا آباد وشاداب کئے ہوئے ہیں۔ وہ ان سب کیفیات سے ٹوٹ کر پیار کرنے والے اچھے انسان اور سچے شاعر ہیں۔ وہ نظم ونثر دونوں میں یکساں محبت اور مہارت سے اپنے تخلیقی جوہر کا اظہار کرتے آرہے ہیں۔ زیرِ نظر نعتیہ شعری مجموعے میں اُن کے جذبات، احساسات، اور الفاظ عشقِ رسول ﷺ میں ڈوبے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ سرکارِ دو عالم سے اُن کا سچا عشق پیکر اشعار میں ڈھل کر ایک ''سعادت'' بن گیا ہے۔ حضور ﷺ کے عشق سے لبریز الفاظ اور اشعار کو کتابی صورت میں شائع کر کے ادارہ ''تعبیر'' واقعی ایک سعادت حاصل کر رہا ہے۔ اُمید ہے باذوق قارئین ''سعادت'' کو پڑھنے کی سعادت سے زیادہ دیر تک محروم نہیں رہیں گے۔

فاروق نسیم کے مجموعہ کلام ''عکاسیاں'' پر تبصرے

(سید شمیم احمد)

فاروق نسیم نے اپنی نظموں میں پابند اور آزاد دونوں ہیئتیں برتی ہیں۔ پابند نظموں میں بھی کئی سانچے اختیار کئے ہیں۔ مگر ذاتی طور پر مجھے ان کی آزاد نظموں میں زیادہ دلنوازی محسوس ہوتی ہے۔ یوں ان کی پابند نظموں میں ایک قسم کی جھنکار اور للکار موجود ہے۔ جوش اور ولولہ کی بھی کمی نہیں۔ مقصدیت کا تقدس چمکتا ہے۔ مگر شاعری کے یہ وہ مقدس اوصاف ہیں جو کسی نوخیز شاعر کو عبدالعزیز خالد کے جادہء سفر کا مسافر بناتے ہیں۔ یا جوش ملیح آبادی کے سردامن تک پہنچا کر چھوڑ دیتے ہیں۔

اعجاز رحمانی لکھتے ہیں۔

۲۔ فاروق نسیم مسلمان ہونے کے ناطے مذہبی رُجحان رکھتے ہیں۔ اور دوسری قوموں کے مزاج آشنا بھی، وہ حمد ونعت مناجات کے علاوہ غزل بھی لکھتے ہیں۔ اُن کا قلم ہر رنگ میں اپنا جوہر دکھاتا ہے۔ ان کی سوچ ہمہ وقت قدیم بھی ہے اور جدید بھی۔ وہ روایات کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے تقاضوں سے بھی واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ایک گہرائی اور گیرائی نظر آتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کا کلام ''عکاسیاں'' ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ثابت ہوگا۔ اعجاز رحمانی۔

❁

رشتوں پر اعتبار کیسے آئے؟
رویّے بدلیں محبت کی فضا قائم ہوگی

ثمینہ فیاض

شوہر جب گھر کا خرچ خود اُٹھائے تو بیوی کو شک رہتا ہے کہ کہیں کسی اور عورت پر تو یہ پیشہ خرچ نہیں ہو رہا۔ کہیں میرا شوہر کسی افیر میں تو نہیں؟ اس شک کی وجہ سے بھی بعض عورتیں اعتبار کے اس خوبصورت رشتے میں بدگمانی پیدا کر دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ اپنا گھر بھی بگاڑ لیتی ہیں اس طرح اگر مرد بھی شکی ہے تو وہ بھی عورت کی ہر بات پر شک کرتا ہے کہ شاید اپنے میکے والوں کو کچھ دیتی ہے میرے گھر سے تم میری اجازت کے بغیر وہاں کیوں گئی۔ گھر کی چھت پر کیا کر رہی تھیں وغیرہ وغیرہ یوں بدگمانیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ دنیا میں ہر انسان کسی نہ کسی دھوکہ سے ڈسا ہوا ہے اعتبار کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ لیکن جب کوئی آزمایا جائے اور ردّعمل کے طور پر دھوکہ دہی نہ ہو تو اس پر بھروسہ کرنا آسان ہو جاتا ہے اگر آپ کسی پر بھروسہ کرتے ہیں تو اس کی بھی کئی وجوہات ہوتی ہے۔ اور اگر آپ کا اعتبار ختم ہو جائے تو یقیناً اس کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے اسی طرح اگر لوگ آپ پر بھروسہ کرتے ہیں تو اس کی وجہ بھی آپ کا ان کے ساتھ مخلص ہونا ہے اور ان کے اس بھروسہ کو قائم رکھنے کی کوشش کو جاری رکھنا ہے۔ کسی کو اچھا یا برا مشورہ دینا بھی آپ پر اعتبار رکھنا یا کھونے کا سبب بنتا ہے۔ بسا اوقات وہ لوگ بھی آپ سے اتنا قریب ہو جاتے ہیں جن سے آپ کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا لیکن آپ کو ان پر بھروسہ ہوتا ہے۔ آپ اُن پر اعتماد اعتبار کرتے ہیں۔ جیسے مثال کے طور پر گھر کے ملازمین۔ خدانخواستہ گھر میں ڈکیتی یا چوری ہوتی ہے۔ تو پولیس کا شک سب سے پہلے گھر کے نوکروں پر جاتا ہے۔ لیکن مالک اگر یہ کہہ دیں کہ نہیں ہی ہمارے اعتبار کے ہیں تو یہ لوگ شک کے دائرے سے کافی حد تک دور ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی وقت میں آپ کا اعتبار کام آتا ہے بعض اوقات ملازمین ایک گھر کے فرد کی طرح بن جاتے ہیں۔ بچوں کا سنبھالنا اور بنا کہے کوئی کام کر دینا اور آپ کی مدد کرتے ہیں کیونکہ وہ آپ کی پسند ناپسند سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہوتے ہیں۔ آپ چاہیں تو اعتماد کی اس فضا میں انہیں آزما بھی سکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایمان خراب ہوتے دیر نہیں لگتی۔ چند سکے یا کوئی اچھی چیز کسی جگہ رکھ کر انہیں آزمان لیجئے۔ جب آپ کے ساتھی کارکنوں کے خلاف دفتری سازش ہو رہی ہو تو ایسے میں یہ بھروسہ کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ آپ کو یقین ہوگا کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ ساتھیوں پر بھروسہ آپ کو سکون رکھتا ہے اور آپ اپنے کام پر زیادہ توجہ دے سکتے ہیں۔ اس طرح آپ پر بھروسہ کر کے آپ کے ساتھی کارکن اچھا کام کر سکتے ہیں۔ ہم معاشرے میں اعتبار کی فضا اس وقت ہی قائم کر سکتے ہیں جب گھر سے اس کی فضا قائم کریں جب انسان اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے تو وہ ایک رشتہ جسے دنیا کا سب سے قابل اعتبار رشتہ کہا جاتا ہے ماں اس کے سب سے قریب ہوتی ہے۔ اور ماں پر اعتبار کرنا بہترین ہے۔ کیونکہ وہ بھی آپ کے بھروسہ کو نہیں توڑتی یہی وجہ ہے کہ آج بھی ماں پر بھروسہ کرنا سب سے بہترین ہے۔ ازواجی زندگی میں بھروسہ کرنا دونوں فریقین کی طرف سے ضروری ہوتا ہے۔ بعض اوقات لڑکیاں اپنے شوہر کی توجہ پانے کے لئے چھوٹی چھوٹی بات پر رو کر یا ذرا سی تکلیف میں یا درد اور بیماری کا بہانہ بنا کر اپنے شوہر کا اعتبار کھو دیتی ہیں۔ اکثر خواتین چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جانے کی ایکٹنگ کرتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں شوہر کی نظر میں وہ ایک ڈرامے باز عورت بن کر رہ جاتی ہیں تو شوہر پرواہ بھی نہیں کرتے۔ بچے بچپن سے ماں کی یہ ڈرامے بازیاں دیکھ دیکھ کر اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ پھر اس کا اثر ختم ہو جاتا ہے۔ کچھ خواتین کو اپنے شوہر کی جیب صاف کرتے ہوئے بھی سنا گیا ہے۔ ان کے خیال میں وہ ان سے اپنا حق چھین رہی ہیں۔ اس طرح وہ اپنے اس غلط اقدام کو چھپاتی ہیں اور پکڑی بھی جائیں تو صاف مکر جاتی ہیں بے اعتباری کے فضا گھر کے اس ماحول کو کبھی بھی خوبصورت نہیں بنا سکتی۔ رشتہ کوئی بھی ہو اعتبار کے بن اس میں شیرینی و چاشنی پیدا نہیں ہو سکتی۔ کوئی آپ پر اعتبار کرے اپنے دل کی بات آپ سے شیئر کرتا ہے تو اس بات کو آپ تک ہی محدود رہنا چاہیے نہ کہ آپ اسے سر عام محفل میں بیان کرتے رہیں اور ازواجی زندگی میں تو یہ بہت ضروری ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے راز اور باتیں اپنے تک محدود رکھیں۔ اکثر اگر شوہر بیوی کے ہاتھ میں اس مہینہ کی تنخواہ یا آمدنی رکھتا ہے تو وہ چند دن میں ختم کر کے اور پیسوں کی توقع رکھتی ہے جس سے بھی شوہر کا اس پر اعتبار نہیں بنتا کہ یہی تو چند دن میں مہینے کی تنخواہ ختم کر دے گی تو وہ آئندہ کی تنخواہ دینے سے گریز کرتا ہے۔ جس پر بھی خاتوں خانہ شاکی رہتی ہے۔ شوہر جب گھر کا خرچ خود اُٹھائے تو بیوی کو شک رہتا ہے کہ کہیں کسی اور عورت پر تو یہ پیشہ خرچ نہیں ہو رہا۔ بے جا شک رشتوں کی نرم و نازل ڈوری کو کاٹنے اور توڑنے کا سبب بن جاتا ہے۔ کسی پر جادو ٹونے کا شک کرنا یا فلاں شخص ہماری برائی کرتا پھرتا ہے۔ وہ تو ہماری مخالفت میں ہی رہتا ہے رشتوں کی چمک اور اس کی آب و تاب تک ماند کر دیتا ہے اعتبار تو آپ کو اُن لوگوں پر بھی ہوتا ہے جو نمائندہ بن کر پیش کرتے ہیں۔ آپ کی ان سے امیدیں بندھ جاتی ہیں کہ اگر مقدر آپ کے ملک کے لئے کھیل رہا ہے تو یقینا کامیابی آپ کا مقدر ہوگی۔ اعتبار تو آپ سیاستدانوں پر بھی کرتے ہیں تب ہی انہیں ووٹ دیتے ہیں کہ یہ آپ کہ ملک کے لئے کچھ کام کریں مگر وہ اعتبار ہی ٹوٹ ہی جاتا ہے اعتبار تو اُن اداروں پر بھی کیا جاتا ہے جو آپ کے محافظ بن کر بیٹھے ہیں مگر وہاں بھی ناکامی دیکھنے کو ملے تو تو یہ سب مل کر معاشرے کو بے اعتباری کی دلدل میں دھکیل دیتے ہیں جہاں انسان کو بے بس

اور انتہا محسوس کرتے ہیں۔ دنیا کا ہر رشتہ سچائی اور خلوص سے نبھایا جائے تو کسی کو کسی سے بدگمانی نہ ہو۔ رشتوں میں خلوص اور احساس شامل رہے تو اعتبار قائم ہوتے دیر نہیں لگتی۔ حساس تو جانور بھی ہوتے ہیں بھوک پیاس گرمی سردی کے احساسات تو انہیں بھی پریشان کرتے ہیں مگر انسان تو اشرف المخلوقات ہے۔ وہ کیوں ایک دوسرے کے احساسات کا خیال نہ کرے وہ کیوں شہر ہوس میں گم رہے؟ وہ کیوں ایک دوسرے کے لئے فرعون بنے کیوں نہ ایک دوسرے کی مجبوریاں سمجھیں۔ انسانوں کی بھیڑ میں رہ کر کیوں تنہا رہیں کیوں نہ ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھیں راز کو راز رکھنے کی اہمیت سمجھیں۔ دوسروں کے ساتھ ساتھ اپنی عزت نفس اور شخصی وقار کو قائم رکھیں تو بہت جلد موافقت کی فضا قایم ہوگی اور کسی کو کسی کے خراب رویوں کی شکایت نہ رہے گی۔ بھروسہ اعتبار صرف رشتوں پر ہی نہیں ہوتا کبھی چیزوں پر بھی ہوجاتا ہے۔ اور ان چیزوں سے بھی بڑا گہرا اور خوبصورت رشتہ بن جاتا ہے۔ جنہیں ہم ہر سال ہر ماہ ہر دن استعمال کرتے ہیں اور بازار میں اگر وہ اشیائ دستیاب نہ ہوں تو ہم بے چین ہو جاتے ہیں اور گلی گلی انہیں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔

انداز تکلم میں شائستگی اپنائیے- ذکر آنٹی کہنے کا

ثقلین مبارک آسٹریلیا

خواتین جس طرح اپنے لئے بننا سنورنا ضروری سمجھتی ہیں وہیں ان کی یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ وہ کم عمر نظر آئیں اس لئے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ جب بھی کسی خاتون کی کم عمری کے پہلو نکلے تو کم عمر سمجھی جانے والی خواتین نہایت خوشی کا اظہار کرتی ہیں دوسری طرف ہمارا معاشرہ جس طرح مغربی تقلید کی طرف جارہا ہے اسی طرح مختلف رشتوں کو بھی وہی مستعار لئے گئے نامدئے جانے لگے ہیں ایسے ہی ایک رشتے کا نام آنٹی ہے مگر یہ لفظ سننا خواتین کے لئے کسی بڑے لفظ سے کم نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ بہت سی خواتین پلٹ کر آنٹی کہہ کر پکارنے والے کو ٹوک بھی دیتی ہیں کہ انہیں آئندہ نہ کہہ کر پکارا جائے لیکن بات تو یہ ہے کہ آخر کس کس کو منع کیا جائے۔ بس میں سفر کریں تو کنڈکٹر بھی خواتین کو آنٹی کہہ کر پکارتے نظر آتے ہیں۔ اگر انجان بن کر نہ سنا جائے کہ ہم آنٹی نہیں تو دوبارہ اسی لفظ سے پکارا جاتا ہے کہ آنٹی جلدی کرایہ دو۔ بازار جائیں تو وہاں بھی حسب دوکاندار آنٹی آنٹی کی گردان لگائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ آنٹی دیکھیں کیا خوبصورت کپڑا ہے۔ دوسری طرف سے کوئی پکار اُٹھتا ہے کہ آنٹی یہ بیگ تو آپ نے دیکھا ہی نہیں آئیں آنٹی گرما گرم سموسے کھائیں اکثر خواتین بھی آپس میں اس لفظ کا استعمال کر کے اپنے تئیں خود کو چھوٹا جتانے کو سرگرم نظر آتی ہیں۔ تاکہ محفل میں سننے والے یہ اخذ کریں کہ یہ یقیناً اپنی مخاطب سے کم عمر ہے۔ ایسے موقع پر یقیناً آنٹی کہی جانے والی لڑکی یا منہ سے کچھ کہہ بھی نہیں پاتیں تاہم انہیں سخت ناگوار گزرتا ہے بہت سی خواتین کا خیال ہے کہ انہیں تضحیک کی غرض سے آنٹی کہا جارہا ہے اس لئے وہ اس انداز مخاطب کو خاطر میں لانا چھوڑ دیں اور اس پر ناک بھوں چڑھائیں اور نہ اپنی زبان سے ایسا تاثر دیں کہ وہ اس سے برا سمجھ رہی ہیں۔ یہ ضروری بھی نہیں ہے کہ مخاطب کرنے والا آپ کی تضحیک کر رہا ہو بلکہ اس سے فقط آپ کو پکارنا مقصود ہونا کہ تضحیک۔ اس لئے اس سے برا نہ منائیں۔ یہ یقیناً ایک بہتر راہ ہوگی کوشش کریں کہ کوئی بڑی عمر کا آدمی آپ کو ''آنٹی'' کہہ کر پکارے تو اسے فوراً بھانجا کہہ کر بلالیں۔ یوں آپ کی بھی تسلی ہوجائے گی۔

دنیا کی 5 مہنگی ترین غذائیں

سید حسن خان

دنیا کی 5 مہنگی ترین غذائیں چھوٹے چھوٹے باریک دانوں پر مشتمل ''بیلوگا کیویئر'' کو دنیا کی مہنگی ترین خوراک کا درجہ حاصل ہے۔

وائٹ ٹرفلز (White Truffles) زیر زمین اُگنے والے ایک خاص مشروم کو وائٹ ٹرفلز کہا جاتا ہے۔ اس کی کم از کم قیمت 80 ہزار روپے فی پاؤنڈ ہے۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ یہ صرف یورپ کے ایک ملک اٹلی کے ایک مخصوص علاقے میں سخت سردی میں ہی اُگتا ہے۔ مورخین کا ماننا ہے کہ یہ قیمتی غذا صرف شاہ بلوط یعنی اوک (Oak) کے درخت کی تہہ میں ہی اُگائی جاسکتی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی کاشت کا فن چند قدیم خاندانوں تک محدود ہے جو اس راز کو بڑی ہوشیاری سے اپنی نسل میں ہی منتقل کرتے ہیں۔ اس خوشبودار مشروم کی تلاش کے لئے خاص نسل کے کتوں پر انحصار کیا جاتا ہے۔ امریکہ میں وائٹ ٹرفلز کی درآمد پر 100 فیصد ٹیرف لاگو ہے اور اسے پُرتعیش غذاؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ قیمتی غذا صرف شاہ بلوط یعنی اوک (Oak) کے درخت کی تہہ میں ہی اُگائی جاسکتی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی کاشت کا فن چند قدیم خاندانوں تک محدود ہے جو اس راز کو بڑی ہوشیاری سے اپنی نسل میں ہی منتقل کرتے ہیں۔

زعفران یا سیفرون (Saffron)

ارجنٹائن، یونان، ایران، ترکی، سپین، بھارت اور مراکش میں کاشت ہونے والی زعفران کا شمار دنیا کے قدیم اور مہنگے ترین مصالحے یا غذا جزو میں کیا جاتا ہے۔ ماہرین کے مطابق زعفران کے مہنگے ہونے کی بڑی وجہ اس کی محدود پیداوار اور کاشت سے لے کر چھانٹی تک کے مراحل میں مزدوری کا بے پناہ خرچ ہے۔ مخصوص موسم میں فصل کی تیاری پر اس کے پھول صرف ہاتھوں سے چنے جاسکتے ہیں جبکہ ہر پھول میں زعفران کی محض چند باریک ڈنڈیاں ہی پائی جاتی ہیں جنہیں

انتہائی احتیاط سے ایک جگہ اکٹھا کر کے خشک کیا جاتا ہے۔ایک اندازے کے مطابق صرف 1 کلوگرام زعفران اکٹھا کرنے کے لئے کم وبیش 400 گھنٹے درکار ہیں اور اس عمل میں سینکڑوں لوگ شریک ہوتے ہیں۔اعلیٰ نسل کے زعفران کی فی گرام کم از کم قیمت 700 روپے ہوتی ہے۔صرف 1 کلوگرام زعفران اکٹھا کرنے کے لئے کم وبیش 400 گھنٹے درکار ہیں اور اس عمل میں سینکڑوں لوگ شریک ہوتے ہیں۔

خوردنی سونا یا ایڈیبل گولڈ

سونا صرف خواتین کی کمزوری ہی نہیں بلکہ اسے بطور غذا بھی دنیا بھر میں پسند کیا جاتا ہے کثافتوں سے پاک 24 قیراط سونا کھانوں کی سجاوٹ اور ان کی غذائیت بڑھانے کے لئے صدیوں سے استعمال ہو رہا ہے۔کھانوں اور مشروبات کی غذائیت اور اشتہا بڑھانے کے لئے پہلے اسے پاؤڈر پتیوں اور باریک اوراق کی شکل میں ڈھالا جاتا ہے اور پھر ضرورت کے مطابق استعمال میں لایا جاتا ہے۔اس سونے کی فی گرام قیمت کم از کم 10 ہزار روپے ہے۔

متا کے مشروم

یوں تو مشروم زکو دنیا کی مقبول ترین غذا کا درجہ حاصل ہے لیکن متا کے مشروم کا استعمال صرف اُمراء تک ہی محدود ہے۔شمالی امریکہ، یورپ اور جاپان جیسے خطوں میں پایا جانے والا یہ مشروم مخصوص قسم کے زمینی اور موسمی حالات میں ہی کاشت ہوتا ہے۔انتہائی کم پیداوار اور خاص لذت کی وجہ سے متا کے مشروم کی فی پاؤنڈ قیمت 2 لاکھ روپے تک ہے۔

بیلوگا کیویئر

سیاسی مسائل چھوٹے چھوٹے باریک دانوں پر مشتمل اس غذا کی دنیا کی مہنگی ترین خوراک کا درجہ حاصل ہے۔اس کی فی کلوگرام قیمت تقریباً 30 لاکھ روپے ہے۔یہ دانے دراصل بحیرہ فزوین یعنی کیسپین سی کے علاقے میں پائے جانے والی ایک مخصوص قسم کی مچھلی بیلوگا کے انڈے ہیں۔یہ مچھلی 20 برس کی عمر میں پہنچ کر انڈے دیتی ہے اور سائز کے اعتبار سے سب سے بڑے انڈوں کو بطور غذا استعمال کیا جاتا ہے۔چونکہ یہ انڈے بہت ہی نایاب ہیں اس لئے یہ اتنے مہنگے بکتے ہیں۔کیویئر کو مختلف ڈشز پر گارنشنگ کے علاوہ کھانوں میں مچھلی کی مخصوص غذائیت پیدا کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

کینیڈا کے متعلق مفید معلومات

زکریا ورک
(ٹورنٹو کینیڈا)
زکریا ورک۔ٹورنٹو

۱۔کینیڈا دنیا کا سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ملک ہے۔اس کی پچاس فی صد آبادی یونیورسٹی ڈگری کی حامل ہے۔

۲۔کینیڈا میں سب سے ٹھنڈا ترین دن ۱۹۴۷ء میں ریکارڈ کیا گیا تھا جب درجہ حرارت منفی 63C تھا

۳۔کینیڈا میں سب سے زیادہ میکارونی اور چیز کھایا جاتا ہے۔

۴۔کینیڈا میں دنیا کی سب سے زیادہ جھیلیں ہیں۔اگر دنیا کی تمام جھیلوں کو شمار کیا جائے تو بھی یہاں زیادہ ہیں۔

۵۔کینیڈا کی نارتھ ویسٹ ٹیریٹری میں کاروں کی لائیسنس پلیٹ پولر بیئر کی شکل کی ہوتی ہیں۔

۶۔کینیڈا میں دنیا کی سب سے لمبی کوسٹ لائن پائی جاتی ہے۔

۷۔کینیڈا کے صوبہ نیوفاؤنڈ لینڈ میں بحرالکاہل کا پانی جم جاتا ہے کہ لوگ پانی پر آئس ہاکی کھیل سکتے ہیں۔

۸۔کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں واقع ینگ سٹریٹ 1896km لمبی ہے۔

۹۔کینیڈا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ درمیان دنیا کا سب سے لمبی سرحد پائی جاتی ہے۔

۱۰۔دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپان کے پرل ہاربر پر حملہ کے بعد کینیڈا نے امریکہ سے پہلے اعلان جنگ کیا تھا۔

۱۱۔کینیڈا کے معنی گاؤں کے ہیں۔کینیڈا IROQUOIAN زبان کا لفظ ہے۔

۱۲۔امریکہ نے کینیڈا پر دوبار حملہ کیا تھا یعنی 18121775 میں۔

۱۳۔کینیڈا میں سعودی عرب اور وینزویلا کے بعد سب سے زیادہ آئیل ریزرو پائے جاتے ہیں۔

۱۴۔کینیڈا میں جاپان کے شہر ٹوکیو سے کم لوگ پائے جاتے ہیں۔

۱۵۔1967ء میں پیرس کے آئیفل ٹاور کو کینیڈا اٹرانسفر کیا جانے لگا تھا۔

۱۶۔امریکہ اور روس کے بعد کینیڈا خلاء میں جانے والا تیسرا ملک تھا۔1962ء میں اس کا خلائی پروگرام سب سے ترقی یافتہ تھا۔

۱۷۔کینیڈا کی سب سے پرانی اسلامی تنظیم جماعت احمدیہ کو اس سال 2015 ہاں قائم ہوئے پچاس سال ہو جائیں گے۔

جستہ جستہ - عاصی صحرائی

انصاف: جج نے چور سے کہا ''تم پر چوری ثابت نہیں ہوسکی' تمہیں باعزت بری کیا جاتا ہے'' چور نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا ''جناب کیا میں اب چوری کی سائیکل استعمال کر سکتا ہوں''

باپ: انسان کو اس وقت تک بچہ پیدا نہیں کرنا چاہیے جب تک وہ باپ بننا نہ سیکھ لے۔

پکی چھت: جو شخص اپنا فرش پکا نہیں کرتا، اسے کبھی پکی چھت نصیب نہیں ہوتی۔

کامیابی: جو لوگ کامیاب نہیں ہونا چاہتے' کامیابی کبھی ان پر ترس نہیں کھاتی۔

میل: جو لوگ دولت کو ہاتھ کی میل سمجھتے ہیں، دولت بھی ان کے ساتھ وہ سلوک کرتی ہے جو صابن میل کے ساتھ کرتا ہے۔

ککھ پتی: وہ ایک ایک روپیہ جمع کرتا رہا' وہ لکھ پتی بن گیا' میں ایک ایک روپیہ خرچ کرتا رہا' میں ککھ پتی ہوگیا۔

نصیب۔ میں جھونپڑی میں رہتا تھا تو روز بارش ہوتی تھی، میں نے چھت پکی کر لی تو بارشیں بھی بند ہوگئیں۔

خارہ: میں نے اس کی نئی قمیض گندی کرنے کے لیے کیچڑ اٹھایا لیکن اس کی قمیض گندی ہونے سے پہلے میرے ہاتھ گندے ہوگئے۔

ہڑتال۔ میرے شہر کی تمام گھڑیوں نے ہڑتال کر دی لیکن وقت کی دکان اس کے باوجود کھلی رہی۔

خوشی۔ مانگنے والے نے مہاتما بودھ سے کہا ''مجھے خوشی چاہیے'' بودھ نے مسکرا کر جواب دیا ''میرے بچے تمہارے مطالبے میں دو چیزیں اضافی ہیں'' مانگنے والے نے پوچھا ''کیا'' بودھ نے جواب دیا ''مجھے اور چاہیے''۔ مانگنے والا حیرت سے دیکھنے لگا' بودھ نے جواب دیا ''تم مجھے اور چاہیے نکال دو، پیچھے خوشی رہ جائے گی''۔

نظریہ ضرورت۔ سیدزادی کے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن تھے، شمر کا فوجی آگے بڑھا، بچی کا ہاتھ پکڑا اور کنگن اتارنے لگا، وہ کنگن اتارتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا، بچی نے پوچھا ''چچا تم کیوں رو رہے ہو'' فوجی نے جواب دیا ''مجھ سے آل رسول ﷺ کا یہ دکھ دیکھا نہیں جاتا'' بچی نے کہا ''تم پھر میرے کنگن کیوں اتار رہے ہو'' اس نے جواب دیا ''بی بی کنگنوں کا اترنا لازم ہو چکا ہے، یہ میں نہیں اتاروں گا تو کوئی اور اتار لے گا''۔

گدھا نہ ہو کہیں کا۔ کمہار کا باپ مر گیا، کمہار گدھے کو شہر لے گیا، ختم کے لیے راشن خریدا اور گدھے بیچارے کو راشن ڈھونا پڑ گیا، کمہار کی بیٹی کی شادی آئی، گدھا کئی دن تک جہیز ڈھوتا رہا، گدھے نے ایک دن سوچا ''ہم بھی کیا مخلوق ہیں، انسانوں کی خوشی ہو یا غمی، بوجھ بہر حال ہمیں ہی اٹھانا پڑتا ہے''

انسان کی موت۔ کراچی میں گولی چل رہی تھی، کتے کے پلے نے کچرہ گھر سے باہر جھانکنے کی کوشش کی، کتیا نے اسے پنجہ مار کر کہا ''بے وقوف، سر اندر رکھو! کیوں انسان کی موت مرنا چاہتے ہو'' اور پلے نے گھبرا کر ماں کے پیچھے پناہ لے لی۔

رزق۔ گورکن نے اپنی بیوی سے کہا ''یہ ڈاکٹر جب سے آیا ہے، ہمارا رزق تنگ ہوگیا' آؤ مل کر اس کے لیے بددعا کریں'' اور بیوی نے جھولی پھیلا کر دہائی دی ''جا ڈاکٹر، اللہ تمہیں غارت کرے''۔

اُردو۔ میں نے رُخصت ہونے سے پہلے میزبان سے کہا ''خان صاحب ماشاء اللہ آپ کی اردو بہت اچھی ہے'' میزبان سادہ سا دیہاتی پٹھان تھا' اس نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر پوری سنجیدگی سے جواب دیا ''نہیں سر! آپ ویسے ہی بکواس کر رہے ہیں''

مسائل۔ میں نے عرض کیا ''میں مسائل میں گھرا ہوا ہوں'' انھوں نے مسکرا کر جواب دیا ''مسائل زندگی کی علامت ہیں، آپ زندہ ہیں تو مسئلے رہیں گے'' وہ رکے اور پھر آہستہ سے بولے ''دنیا میں صرف ایک جگہ ہے جہاں کوئی مسئلہ نہیں'' میں نے پوچھا ''کون سی جگہ'' وہ بولے ''قبرستان''۔

کاروبار۔ میں نے پوچھا ''کیا میں کاروبار کر سکتا ہوں'' وہ بولے ''ہاں اگر آپ 24 میں سے 16 گھنٹے مسکرا سکتے ہیں تو!''

کامیابی۔ آپ کو نہ ماننے والے لوگ آپ کی کامیابی کے بعد لوگوں کو بڑے فخر سے بتاتے ہیں ''دیکھو یہ میرا دوست ہے''۔

قصوروار۔ آپ غریب پیدا ہوئے ہیں تو آپ بے قصور ہیں لیکن آپ اگر غریب مر جاتے ہیں تو آپ اپنی غربت کے خود قصوروار ہیں۔

محسن۔ کسان کی عزت کرنا سیکھیں' کیوں؟ کیونکہ آپ کو زندگی میں وکیل' ڈاکٹر اور آرکی ٹیکٹ کی ضرورت کبھی کبھی پڑتی ہے لیکن کسان روز انہ ناشتے' لنچ اور ڈنر کے وقت تین بار آپ پر مہربان ہوتا ہے' یہ ہمارا زیادہ بڑا محسن ہے۔

کبھی ہار نہ مانیں۔ کچھ لوگ ناکام ہو کر ہار مان لیتے ہیں اور کچھ اس وقت تک بغیر ہار مانے فیل ہوتے رہتے ہیں جب تک وہ کامیاب نہیں ہو جاتے۔

حق۔ دنیا انسان سے سارے حق چھین سکتی ہے لیکن اس سے محنت کرنے' محبت کرنے' اللہ کے حضور توبہ کرنے اور اس سے دعا کرنے کا حق نہیں چھین سکتی چنانچہ آخری سانس تک جی بھر کر یہ حق استعمال کرتے رہیں۔

دنیا آپ کے قدموں میں۔ زندگی' عزت اور رزق اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے چنانچہ روٹی کے لیے' عزت کے لیے اور سانسوں کے لیے لوگوں سے' حکومتوں سے اور حالات سے گھبرانے کی ضرورت نہیں' خود پر اعتماد اور اللہ پر بھروسہ رکھیں' دنیا آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔

جستہ جستہ - عاصی صحرائی

جو وقت آپ دوسروں پر تنقید کرنے میں گزارتے ہیں، وہی وقت خود کو بدلنے پر صرف کریں کیونکہ کسی کو بدلنا تو آپ کے اختیار میں نہیں لیکن خود کو تو بدلنا آپ کے اختیار میں ہے۔ دنیا کو نہیں خود اپنے آپ کو بدلیں۔ سب کچھ بدل جائے گا۔

اہم سوال

اہم سوال یہ نہیں ہے کہ موت کے بعد زندگی ہے یا نہیں اہم سوال یہ ہے کہ موت سے پہلے تم زندہ ہو یا نہیں؟۔

روش

ماں نے آٹھ بچے پال پوس کر جوان کیے لیکن آٹھ بچے مل کر ماں کو چار سال نہ پال سکے۔

بے چھت

زلزلہ آیا پورا شہر مر گیا' صرف میں بچا' کیوں؟ کیونکہ میرے سر پر چھت نہیں تھی اور زلزلے بے چھت لوگوں کو کچھ نہیں کہتے۔

کان

میں نے اپنے پیٹ کو ہزاروں دلیلیں دیں، لیکن یہ نہ مانا، میں نے تنگ آ کر اس پر ہاتھ پھیرا تو مجھے پتہ چلا میرے پیٹ کے کان ہی نہیں ہیں، یہ بے چارہ کیسے سنتا!۔ اعلیٰ ظرف۔ وہ زندگی کے آخری حصے میں کثرت سے دعا کیا کرتے ہیں ''یا باری تعالیٰ! مجھے پھل دار درختوں جتنا ظرف عطا فرما دے'' ہم پوچھتے تھے ''بابا جی یہ خواہش کیوں؟'' وہ جواب دیتے تھے ''میں نے آج تک کسی کو پھل دار درختوں سے زیادہ اعلیٰ ظرف نہیں پایا''۔ ہم پوچھتے تھے ''کیسے؟'' وہ جواب دیتے تھے ''ہم درختوں کو پتھر مارتے ہیں' یہ بے چارے زخمی ہو جاتے ہیں لیکن جواب میں اپنا میٹھا ترین پھل ہماری طرف اچھال دیتے ہیں' مجھے انسانوں میں کوئی اتنا اعلیٰ ظرف شخص دکھا دو''۔

انصاف

حضرت موسیٰ نے اللہ سے پوچھا ''یا باری تعالیٰ فرعون خدائی کا دعوے دار تھا لیکن تم نے اس کے باوجود اس کی رسی دراز رکھی'' اللہ تعالیٰ نے جواب دیا ''موسیٰ! فرعون انصاف پسند تھا' میں اسے کیسے برباد کر دیتا''۔

بددعا

میرا اس شہرِ عداوت میں بسیرا ہے کہ جہاں لوگ سجدوں میں بھی لوگوں کا برا سوچتے

فیڈ بیک

لڑکے نے فون پر پوچھا ''سر کیا آپ کو اچھا ڈرائیور چاہیے'' دوسری طرف سے جواب آیا ''میرے پاس بہت اچھا ڈرائیور موجود ہے'' لڑکے نے کہا ''سر میں آدھی تنخواہ پر کام کرنے کے لیے تیار ہوں'' جواب ملا ''نہیں شکریہ! آپ اگر مفت بھی کام کریں تو بھی میں اپنا ڈرائیور نہیں چھوڑوں گا'' فون بند ہو گیا، پی سی او کا مالک سن رہا تھا، اس نے افسوس سے کہا ''بیٹا ہمت نہیں ہارنی، تمہیں نوکری ضرور ملے گی'' لڑکے نے قہقہہ لگایا اور بولا ''میں ان کا ڈرائیور ہوں، میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا' کیا یہ لوگ میرے کام سے مطمئن ہیں؟'

علاج

میں ڈاکٹر بدلتا رہا، میں دوائیں بھی تبدیل کرتا رہا لیکن شفاء نصیب نہ ہوئی، مجھے آخر میں پتہ چلا، خرابی دواؤں اور ڈاکٹروں میں نہیں تھی، نقص مجھ میں تھا، میں بزدلی کے مرض میں مبتلا ہوں اور بزدل مریضوں کو کسی دواء کسی ڈاکٹر سے شفاء نہیں ہوتی۔

اشرف المخلوقات

جانوروں نے ایک دن اللہ سے شکوہ کیا ''بھینسیں اپنے بچھڑوں کے لیے دودھ دیتی ہیں لیکن انسان پی جاتا ہے، مرغیاں اپنی نسل بڑھانے کے لیے انڈے دیتی ہیں لیکن انسان کھا جاتا ہے اور بھیڑ بکریاں اپنی افزائش کے لیے میمنے جنتی ہیں لیکن انسان انھیں بھی چٹ کر جاتا ہے'' اللہ نے پوچھا ''پھر'' جانوروں نے کہا ''یا باری تعالیٰ! انسان اس کے باوجود اشرف المخلوقات ہے اور ہم جانور' کیا یہ ظلم نہیں''۔

اگنور

میں نے شکوہ کیا ''لوگ آج کل مجھے بہت برا بھلا کہتے ہیں'' وہ ہنسے اور کہا ''یہ برا بھلا اس سے سو گنا اچھا ہے کہ لوگ تمہیں کچھ بھی نہ کہیں، تمہیں اگنور کر کے گزر جائیں''۔

اُردو

میں نے رُخصت ہونے سے پہلے میزبان سے کہا ''خان صاحب ماشاءاللہ آپ کی اردو بہت اچھی ہے'' میزبان سادہ سا دیہاتی پٹھان تھا' اس نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر پوری سنجیدگی سے جواب دیا ''نہیں سر! آپ ویسے ہی بکواس کر رہے ہیں''۔

مسائل

میں نے عرض کیا ''میں مسائل میں گھرا ہوا ہوں'' انھوں نے مسکرا کر جواب دیا ''مسائل زندگی کی علامت ہیں، اپ زندہ ہیں تو مسئلے رہیں گے'' وہ رکے اور پھر آہستہ سے بولے ''دنیا میں صرف ایک جگہ ہے جہاں کوئی مسئلہ نہیں'' میں نے پوچھا ''کون سی جگہ'' وہ بولے ''قبرستان''۔

کاروبار

میں نے پوچھا ''کیا میں کاروبار کرسکتا ہوں'' وہ بولے ''ہاں اگر آپ 24 میں سے 16 گھنٹے مسکرا سکتے ہیں تو!''

کامیابی

آپ کو نہ ماننے والے لوگ آپ کی کامیابی کے بعد لوگوں کو بڑے فخر سے بتاتے ہیں ''دیکھو یہ میرا دوست ہے''۔

قصوروار

آپ غریب پیدا ہوئے ہیں تو آپ بے قصور ہیں لیکن آپ اگر غریب مرجاتے ہیں تو آپ اپنی غربت کے خود قصوروار ہیں۔

محسن

کسان کی عزت کرنا سیکھیں' کیوں؟ کیونکہ آپ کو زندگی میں وکیل' ڈاکٹر اور آرکی ٹیکٹ کی ضرورت کبھی کبھی پڑتی ہے لیکن کسان روزانہ ناشتے' لنچ اور ڈنر کے وقت تین بار آپ پر مہربان ہوتا ہے' یہ ہمارا زیادہ بڑا محسن ہے۔

کبھی ہار نہ مانیں

کچھ لوگ ناکام ہوکر ہار مان لیتے ہیں اور کچھ اس وقت تک بغیر ہار مانے فیل ہوتے رہتے ہیں جب تک وہ کامیاب نہیں ہوجاتے۔

حق

دنیا انسان سے سارے حق چھین سکتی ہے لیکن اس سے محنت کرنے' محبت کرنے' اللہ کے حضور توبہ کرنے اور اس سے دعا کرنے کا حق نہیں چھین سکتی چنانچہ آخری سانس تک جی بھر کر یہ حق استعمال کرتے رہیں۔

دنیا آپ کے قدموں میں

زندگی' عزت اور رزق اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے چنانچہ روٹی کے لیے' عزت کے لیے اور سانسوں کے لیے لوگوں سے' حکومتوں سے اور حالات سے گھبرانے کی ضرورت نہیں' خود پر اعتماد اور اللہ پر بھروسہ رکھیں' دنیا آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔

وہاں جگہ خالی ہے

مغرب کی اذان ہورہی تھی' میں کار پارکنگ کے لیے شاپنگ پلازا میں جگہ ڈھونڈ رہا تھا' میں نے ایک نوجوان سے پوچھا ''پارکنگ کہاں مل سکتی ہے'' اس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا ''آگے مسجد کے سامنے لگا دیں' وہاں جگہ ہوگی''۔

خطرناک

سقراط کا صرف ایک جرم تھا' وہ سوچنا جانتا تھا چنانچہ وہ خطرناک تھا' وہ اس وقت مزید خطرناک ہوگیا جب اس نے لوگوں کو سوچنا سکھانا شروع کر دیا اور لوگوں نے اس سے متاثر ہوکر اپنے زنگ آلود عقائد اور دیمک زدہ روایات پر سوالات اٹھانا شروع کر دیے لہٰذا ریاست اسے قتل نہ کرتی تو کیا کرتی؟۔

برف کا گولہ

میں نے اس سے کہا ''تم میرے ساتھ دوستی کرو گے'' اس نے برف کا گولہ بنایا اور میرے ہاتھ میں تھما دیا' میرے دیکھتے ہی دیکھتے گولہ پگھل گیا' اس نے میرے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور کہا ''میرے بھائی دوستی برف کے گولے کی طرح ہوتی ہے' اسے بنانا آسان مگر برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے''۔

غزل - طفیل عامر

انہونی کوئی ہوگی، یہ ڈر کیوں نہیں جاتا
قسمت کا لکھا سر سے گزر کیوں نہیں جاتا
موجود ہے اس میں تو لبوں تک بھی یہ آئے
خالی ہے اگر جام تو بھر کیوں نہیں جاتا
احساس کو نہ اس کی وہ شدت ہی کو سمجھیں
جو پوچھتے ہیں دل سے اثر کیوں نہیں جاتا
دستک سے تھکے ہاتھ، صدا دیتا رہا میں
آنکھوں سے مری بند وہ در کیوں نہیں جاتا
ساحل پہ کھڑے میرے دعا گو کی یہ خواہش
کشتی کو لئے ساتھ بھنور کیوں نہیں جاتا
سو بار مرے کانوں میں سرگوشی ہوئی ہے
جینا نہیں آتا ہے تو مر کیوں نہیں جاتا
بُو باس بسے اُس کی، ہر اک شے میں ہے چہرہ
کیوں پوچھتے ہو مجھ سے میں گھر کیوں نہیں جاتا
ہاتھوں سے ترے مرنے میں ہے ایک فضیلت
اے عشق! رگِ جاں میں اُتر کیوں نہیں جاتا
جن رستوں کی میں خاک رہا چھانتا عامرؔ
اُن میں سے کوئی رستہ اُدھر کیوں نہیں جاتا